ایش ٹرے

شکیل اعظمی

آپ کے یہاں دوسروں سے ہٹ کر بات کرنے کا خاص سلیقہ ہے، جو قابلِ قدر ہے۔

۷ر نومبر ۱۹۹۸ء (پاکستان)　　　　وزیر آغا

شکیل اعظمی غزل اور نظم دونوں اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن عملی حصول کے تناظر میں وہ ذہنی طور پر غالباً غزل کے اور نظم کے تعلق سے آزاد نظم کے ترجیحاً زیادہ قریب ہیں۔ جہاں غزل کے کلاسیکی اہتمام میں وہ تازہ کار عصری احساس کی آمیزشوں سے مختلف النوع کیفیات کا جادو جگاتے ہیں وہاں نظم میں وہ عام زندگی کے تجربوں، ذاتی وابستگیوں اور محرومیوں، شخصی اور اجتماعی ترسیل اور عدم ترسیل کی صورتوں اور عصری زندگی کے تضادات اور احساسِ زیاں کی تجسیم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایش ٹرے، ایکسیڈنٹ، سیلزگرل جیسے انگریزی الفاظ اردو الفاظ میں ایسے رچ بس کر سامنے آئے ہیں کہ تخلیقی طور پر انہی کی توسیع محسوس ہوتے ہیں۔

۱۳ر اپریل ۱۹۹۷ء (دہلی)　　　　بلراج کومل

تم بہت اچھے شاعر ہو، تمہاری زبان شگفتگی اور تازگی لیے ہوئے ہے۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۹۶ء (لندن)　　　　ساقی فاروقی

شکیل اعظمی وہاں سے شاعری شروع کر رہے ہیں جہاں پہنچ کر میری شاعری دم توڑنے والی ہے۔ ان کی شاعری میں جو تازہ کاری ہے اس نے خاص طور سے مجھے متاثر کیا ہے۔

ار مئی ۱۹۹۷ء (ممبئی)　　　　کیفی اعظمی

موت سے خوف زدہ ہو کر میں آج کل صرف پانچ سگریٹ روز پینے لگا ہوں۔ مگر آج آپ کو پڑھتے ہوئے میں ان دو ہی گھنٹوں میں یکے بعد دیگرے پانچ سگریٹ پی گیا اور ایسا کر کے اپنے آپ کو زیادہ صحت مند اور سبک محسوس کر رہا ہوں۔ اتنی اچھی شاعری پڑھنے کا موقع کبھی ملتا ہے جب قسمت میں ہو۔

۲۲ر ستمبر ۱۹۹۷ء (دہلی)　　　　جوگندر پال

شکیل اعظمی کی شاعری قدم قدم پر اپنے خالق کے تخلیقی ذہن کی برق تابی سے آنکھوں کو روشن کرتی ہے۔ شکیل اعظمی بلند نگہی، دردمندی اور خود آگہی سے اپنے عصر کے سماجی اور سیاسی حالات کی پیچیدگیوں اور تضادوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور انسانی رشتوں کے تقدس، حسن اور لطافت کی بے توقیری کو دیکھ کر روحانی کرب سے گزرتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ کم عمری کے باوجود ردِ عمل کے طور پر اپنے باطن میں کھلبلی پیدا کرنے والے جذبات کی تہذیب کرتے ہیں۔ اور جذباتیت کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیتے اور ضبط و تحمل سے داخلی درد و کرب کو لفظ و پیکر میں سموتے ہیں۔ ان کی جدید حسیت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ استحصال، جبر اور تشدد کی قوتوں کے ہاتھوں خیر و برکت کی ناگزیر پامالی کے عذاب کو سہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ گاہے گاہے طنزیہ خود ضبطی پر منتج ہوتا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ زندگی اور فطرت کے مابین رشتوں کی رنگارنگی کے منکر ہیں۔ وہ پر آشوب حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنے وجود کی جمالیاتی اور جبلی مقتضیات سے آگاہ ہیں۔ اور اندھیروں میں لمحوں کو گلنار کرنے کے رویے کو روا رکھتے ہیں۔ شکیل اعظمی نئی نسل کے ان معدودے چند شعراء میں یقیناً نمایاں ہیں جو گروہی اور نظریاتی وابستگیوں سے نجات پا کر کھلے ذہن سے اپنے وجود کے تخلیقی سرچشمے سے رابطہ قائم کرتے ہیں اور اپنے انفرادی لسانی اظہار کو وضع کرتے ہیں۔

۲۸ر مئی ۱۹۹۷ء (سری نگر) حامدی کاشمیری

شکیل اعظمی کا شعری سفر خاصا دلچسپ ہے۔ وہ اپنے زاویے اور اپنی آنکھ سے زندگی کو دیکھتے ہیں اس سے مکالمہ کرتے ہیں اور پھر اسے اپنے شاعر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں اپنی ذات کے حوالے سے بھی زندگی کی تفسیر ملتی ہے۔ ان کے سوچنے اور اپنے اردگرد پر نظر ڈالنے کے انداز میں باریک بینی ہے اور اسی لئے ان کی نظم یا غزل اوپری سطح پر کم تیرتی ہے گہرائی میں ہونے والی ہلچل سے سروکار رکھنے کا جذبہ انھیں مضطرب رکھتا ہے۔ شکیل اعظمی کا اب تک کا شعری سفر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے یہ خود اپنی جگہ پر کچھ کم اہم نہیں ہے۔

۱۱ر جولائی ۱۹۹۷ء (دہلی) زبیر رضوی

ایش ٹرے

شکیل اعظمی

معیار پبلی کیشنز

ندا فاضلی کے نام

جیسے اس شخص میں میرا ابھی کوئی حصہ ہو

خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں

ادب اور مٹی کے حوالے سے

ASHTRAY

By :

SHAKEEL AZMI

پتہ: ۱۸۰۸/۵ بندا اسٹورس، مین روڈ، سید پورہ، سورت ۳۹۵۰۰۳ (انڈیا)

سرورق	:	شاہد علیگ
پہلا ایڈیشن	:	جنوری 2000ء
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	ایک سو روپے
طابع	:	عزیز پرنٹنگ پریس، نئی دہلی
زیر اہتمام	:	محمد کاظم حکیم، رضوان عثمانی، ضمیر اعظمی، مرزا عذیر اعظمی

معیار پبلی کیشنز

کے۔۳۰۲/تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱

ترتیب

غزلیں

اس کتاب کی اشاعت میں گجرات اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے ۔

نظمیں

غزلیں

نظمیں

آسمانِ ادب پر ایک نیا ستارہ

شکیل اعظمی سے میری پہلی ملاقات سورت میں اردو کے مشہور محقق ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے دولت کدے پر ہوئی۔ میرے داماد سورت میں ڈاکٹر ہیں اور میں اپنی نواسیوں کو کھیل لگانے اکثر سورت جاتا رہتا ہوں۔ ایک شام ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے یہاں پہنچا تو وہ ایک نوجوان کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ نام شکیل اعظمی ہے اور شاعری سے شوق فرماتے ہیں۔ یہ میرے لئے نئی اور دلچسپ بات نہیں تھی۔ گجرات جیسے علاقوں میں اب اردو وہی جانتا ہے جو شعر کہتا ہے یا عملیات کی کتابیں دیکھ کر تعویذ گنڈے لکھتا ہے۔ شکیل مجھے ان نوجوانوں میں سے نظر آیا جو اردو زبان ہی کی مانند غریب الدیار، مفلوک الحال، جہدِ بقا کی تگ ودو میں سرگرداں بڑے شہروں کی بھیڑ میں ایک اجنبی، تنہا اور بے چہرہ آدمی کی زندگی گزارتے ہیں۔ (ان تجربات کا عکس آپ کو شکیل کی نظموں میں نظر آئے گا) رائیگانیِ حیات ان کا مقدر ہے اور رائیگانی کی جملہ دوسری وجوہات میں اگر ایک وجہ شعر گوئی کا شوقِ فضول ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دل میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا۔ شکیل مجھ سے بڑی گرم جوشی اور محبت سے ملا لیکن مجھے اس میں کوئی خاص دلچسپی پیدا

نہیں ہوئی۔ اور اس مختصر ملاقات کے بعد میں اسے یکسر بھول گیا۔ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد سورت میں خاکسار کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ یہاں خاکسار کا لفظ خاکساری سے استعمال ہوا ہے ورنہ کم از کم گجرات میں عمر گزری ہے مشاعروں کی صدارت کرتے۔ اگر انکساری کو بر طرف رکھوں تو کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملہ میں میرا مرتبہ صدر الصدور کا ہے اگر شاعری کوئی روحانی ریاضت کی چیز ہوتی تو فدوی نے جس جبر و صبر سے شاعروں کی شب زندہ داریاں جھیلی ہیں ان کے سبب اسے ایک ایسے مرتاض بزرگ کا مرتبہ حاصل ہوتا جس کا آستانہ تو سولہواں اور سترہواں غزلوں کی جھاڑ پھونک کے لئے مرجع شعرائے کرام ہوتا۔

بہر حال مذکورہ مشاعرے میں یہ خاکسار شعراء کے بلند بانگ شعبی اور اپنے قطعے نوم کے سیلاب میں اقبال کے اہل ایماں کی مانند ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر نکلے ادھر ڈوبے کے عالم میں مسند صدارت کو زینت بخش رہا تھا کہ یکایک داد و تحسین کا ایسا غلغلہ بلند ہوا کہ میں بھی واہ واہ پکارنے کے لئے ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ دیکھا ایک نوجوان شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے۔ صورت آہستہ آہستہ رنگ شناسائی پکڑنے لگی۔ ارے یہ تو وہی اول جلول لڑکا ہے جس سے مدنی صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اور اب دیکھو کیسی پر جلال آواز میں مشاعرے کو زیر و زبر کر رہا ہے۔

مشاعرے کے بعد سرکٹ ہاؤس میں جہاں شعراء کا قیام تھا ایک بے تکلف محفل جمی جس میں ندا فاضلی، محمد علوی، جاوید اختر اور راقم الحروف پچھلے پہر تک شکیل سے غزلیں سنتے رہے۔ یہاں شاعری کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس رات مجھے محسوس ہوا کہ خدا داد صلاحیت کیا ہوتی ہے۔ شاعر بنانا نقادوں اور پروفیسروں کے ہاتھ میں ہوتا تو وہی لوگ شاعر بنتے جو غزل پر مقالہ لکھتے۔ لیکن جبریل چونکہ ناقد نہیں اس لئے راستہ نہیں بھولتے۔ دستک ہمیشہ اسی مجنون صحرا گرد کے خانہ بے دروازہ پر دیتے ہیں جس کی چشم تخیل نے محمل شاعری میں جمال دلفروز کا نظارہ کیا ہے۔ سچا تخلیقی جوہر اندھیری رات میں ایک ستارے کی

مانند روشنی کی لکیر بناتا ہوا ظاہر ہوتا ہے۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں۔ کم از کم اس رات تو ہمیں یہی محسوس ہوا۔ شکیل نے جو شعر سنائے ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ صحبت یاراں اور رات کا جادو تھا یا اشعار کا جو دلوں کو مسحور کر رہا تھا۔

بھلا ہوا کہ ترا ظلم ہو گیا، ورنہ
بہت دنوں سے ہمیں دعوئے خدائی تھا

....

گلی کے موڑ سے آواز دیکے لوٹ آئے
تمام رات اسے بے قرار رہنے دیا

....

کچھ دیر تک تو معرکہ آرائی ٹھیک تھی
پھر یوں ہوا کہ شاہ بھی پیادہ لگا ہمیں

....

مجھے نہ توڑ، کہ آگے خزاں کا موسم ہے
مرے علاوہ ترے بن میں پھول کوئی نہیں

....

وہ دور ہو تو لگے اس سے کوئی رشتہ ہے
قریب آئے تو میں اس کا کچھ لگوں بھی نہیں

....

کسی کے لمس کو محسوس کرکے دیکھ ذرا
تمام جسم ہی میخانہ لگنے لگتا ہے

اچھا ہے میرے غم کا کسی کو پتا نہیں
اس گھر میں کوئی میرے سوا جاگتا نہیں

....

ناقدری سفر سے کو تھک چکے ہیں ہم
اب دوسرے سفر کا ہمیں حوصلہ نہیں

....

تمام رنگ لہو میں تعصبات کے تھے
چراغ جتنے جلے سب گواہ رات کے تھے

....

اٹھا چکے ہیں انھیں ہاتھ سرد لمحوں کے
ہمارے بیچ جو پتھر تعلقات کے تھے

....

درختوں پر قصیدے لکھ رہا ہوں
کلہاڑی میں ابھی دستہ نہیں ہے

....

زمانہ تھک چکا تھا زہر دے کر
میں اپنی موت بھی مرتا نہیں تھا

....

بچھڑتے وقت جلا تھا جو اس کی آنکھوں میں
وہی چراغ مری رہگذر میں رکھا تھا

....

جانے کیسا رشتہ ہے رہگذر کا قدموں سے
تھک کے بیٹھ جاؤں تو راستہ بلاتا ہے

....

رکھ دے سنبھال کر، کہ کبھی کام آئے گا
پتھر جو آگیا ہے اسے رائگاں نہ کر

....

یہ شرط بھی لگادی گئی اب کے کھیل میں
جلنے کے بعد رسّی کا بل جانا چاہئے

....

تم بھی ذرا سی بات کو گھر لے کے آگئے
فٹ پاتھ پر جو مرگیا انسان ہی تو تھا

....

انسانیت کو خیر نہیں شر بھی چاہئے
نیزے کی پرورش کے لئے سر بھی چاہئے

....

جنگل کا مور ناچ بہت ہوچکا قلیل
وحشت کی ارتقا کے لئے گھر بھی چاہئے

....

افق کا خون محبت کا قتل ہے جاناں!
کہ آسمان زمیں سے وہیں پہ ملتا تھا

....

اجالے چار سو پھیلے، دیے جلے ہی نہ تھے
ہوا اٹھانے جب آئی تو ہم جلے ہی نہ تھے

....

یہ بھید ہم پہ کھلا اک حسیں کی قربت سے
گلاب میں ہے جو کانٹا بڑا نکیلا ہے

....

پھر ترے شہر میں وحشت کا تماشا ہوگا
پھر ترے شہر میں اک شخص اکیلا ہے بہت

....

ان اشعار میں ایک نوکیلا پن ہے، نکتہ آفرینی بھی ہے اور قولِ محال کا لطف بھی ہے۔ شکیل کے یہاں خیال تجرید کی سطح پر نہیں ملتے۔ احساس بھی کیفیت کی سطح پر بیان نہیں ہوتا۔ ہر خیال اور احساس استعارے میں ڈھل جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ استعارہ ٹھوس شعری پیکر کو جنم دیتا ہے معنوی تہ داریوں کے سبب شعری تجربہ پراسرار بن جاتا ہے۔ تجربہ کی سریت اور معنی کی وضاحت کا یہ کھیل بہت دلچسپ ہے۔ مثلاً شکیل کا یہ شعر دیکھئے۔

جانے کیا رشتہ ہے رہگذر کا قدموں سے
تھک کے بیٹھ جاؤں تو راستہ بلاتا ہے

معنی صاف ہیں لیکن راستہ کے بلاوے میں سمندر یا پہاڑ کے بلاوے کی مانند حیاتیاتی سریت کا عنصر رہا ہے۔ پاؤں چلنے کے لئے اور راستہ پاؤں کے لئے بنا ہے۔ یہ بیان واقعہ ہے لیکن استعارہ بھی ہے۔ کس چیز کا؟ بہت سے احساسات کا، شاہراہِ حیات اور راہِ عشق کا،

زندگی کی تگ ودو کا، تخلیقی تحقیقی کام کا کہ آدمی تھک جاتا ہے پھر بھی کئے جاتا ہے۔ کسی مخصوص امر کی طرف اشارہ نہیں۔ ایسی عمومیت اور آفاقیت خیال کے لئے تجریدیت کا پیراہن لاتی ہے لیکن جہاں رہگذر، قدم، چلنا اور تھکنا ہو وہاں تجریدیت کی جگہ ایک ٹھوس شعری پیکر جنم لیتا ہے۔ غزل کے تخلیقی طریقہ کار کا یہ امتیازی وصف ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ شکیل اعظمی کا تخلیقی رویہ ان وضع داریوں اور نزاکتوں کو حساب میں رکھتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کی غزلوں میں بھی استعارے اور کنائے کا یہی حسن نظر آتا ہے۔ دو شعر سنئے۔

ہوا نے ایسا بکھیرا کہ یہ بھی یاد نہیں
نہ جانے کون سے صحرا کی خاک تھے ہم لوگ

....

نہ کوئی نقشِ قدم ہے، نہ کوئی راہگذر
نہ جانے کون سے جنگل میں آگئے ہم لوگ

....

پہلا شعر عالم گیر پیمانے پر جاری انتشار اور ہجرتوں کا آئینہ ہے تو دوسرا شعر مابعد جدید معاشرے کی لامرکزیت کی زائیدہ نراجیت کا ترجمان۔ زیرِ نظر مجموعہ سے کچھ اور شعر دیکھئے۔

ایسی سردی ہے کہ اس بار مرے ہاتھوں سے
ڈر رہا ہوں کہ ترا لمس نہ کھونے لگ جائے

....

تنہائی محدود نہیں ہے دیواں تک
گھر کے باہر بھی گہرا سناٹا ہے

....

رات بہت لمبی ہے، کمرہ چھوٹا ہے
رستہ دروازے تک پھیل کے سویا ہے

لوگ میرے خلاف تو تھے ہی
اپنے حق میں گواہ میں بھی نہ تھا

سائے سب دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے
سورج اب سہما ہی آتا جاتا ہے

چٹانیں سب ڈوب چکی ہیں پانی میں
دریا بے آواز یہاں سے بہتا ہے

مری صدا ہی مری نیند توڑ دیتی ہے
نہ جانے خواب میں کس کو پکارتا ہوں میں

خیالِ یار ہے اک بحرِ بیکراں کی طرح
ذرا سا سوچا تھا اور ڈوب سا گیا ہوں میں

پھر وہی شام، وہی دن، وہی تاریخیں ہیں
یعنی ہم گذرے مہینے کی طرف چلتے ہیں

جو لوگ چاند پہ خیمے لگا رہے ہیں شکیل
انھیں کہو یہ کوئی آخری مجوبہ نہیں

گذشتہ جنگ میں غداریاں تھیں جن کے نام
عجب کہ سر بھی سلامت انھی قدموں پہ ہیں

لیکن غزلوں کی جو بہار شکیل کے پہلے مجموعہ "دھوپ دریا" میں تھی وہ "ایش ٹرے" میں خزاں گزیدہ لگتی ہے۔ غزل کی شاعری کو ویسے بھی بھرتی کے اشعار سے پاک رکھنا آسان نہیں۔ میرا خیال ہے سوائے غالب، اقبال اور فیض کے مرصع غزلیں زیادہ تر شعراء کے یہاں کم ہی نظر آتی ہیں۔ اکثر وبیشتر تو شاہ بیت کے علاوہ دوسرے تمام اشعار پیادے ہی ہوتے ہیں جو وردی پوش اور بے چہرہ ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ جنگ میں بھیڑوں بکریوں کی طرح ہلاک ہوتے ہیں۔

خیر غزل تو ہمارے یہاں شاعر سازی کی آسان مشین بن گئی ہے۔ یعنی شاعر سے کچھ نہ بن پائے تو غزل پر تکیہ اور اکتفا کر سکتا ہے۔ لیکن نظم بھی اب قدرتِ کلام کی کسوٹی کہاں رہی۔ غزل کے آسان نثری بلکہ سپاٹ شعر کو تو آپ سہلِ ممتنع میں کھپا سکتے ہیں۔ سپاٹ نظم کو کہاں کھپائیں گے؟ نثری نظم میں؟ نظمِ معریٰ کے بعد نثری نظم کے پاس برہنہ ہونے کے لئے بچا ہی کیا ہے۔ ننگی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا۔ چنانچہ آج کل ہزاروں کی تعداد میں نظمیں لکھی جا رہی ہیں جن کے متعلق کم از کم میں تو اس مخمصے میں پڑ جاتا ہوں کہ آیا یہ نثری ہیں یا غیر نثری۔

اس معنی میں شکیل اعظمی کی نظمیں پر فریب ہیں۔ بادی النظر میں وہ سامنے کی چیزوں اور تجربات کا اکثر سیدھا سادا بلکہ سپاٹ اور نثری بیان معلوم ہوتی ہیں لیکن گہری نظر سے دیکھیں تو ان میں اظہار کا تیکھا پن اور چوکسائی بھی ہے اور معنی کی نئی جہتیں بھی۔ ویسے نظموں کی سادگی سے تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ شکیل قلم برداشتہ لکھ لیتے ہیں اور جو بات ذہن میں آتی ہے اسے بے پروائی اور بے دلی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ لیکن مجھے شکیل کے یہاں نظم کی ہیئت اور اسلوب کی طرف شعوری نہ سہی، غیر شعوری سہی نظم و ضبط کا

احساس ہوا ہے۔ ان کی نظموں میں تین چیزیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ برجستگی، ایجاز اور نظم کا غیر متوقع چونکانے والا انجام۔ جس شاعر کے پاس کم از کم یہ تین صفات ہوں تو وہ جدید شاعری کے پُل صراط سے سلامت گذر جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جدید شاعر کے پاس کلاسیکی ڈکشن اور اسلوب کا وہ سرمایہ نہیں۔ جو شعری زبان کے فارسی سرچشموں کا رہینِ منت تھا۔ اس کے پاس وہ شعری آہنگ بھی نہیں۔ جو پابند ہی نہیں بلکہ نظم معریٰ بلکہ نظم آزاد تک میں روایتی عروضی نظام کا عطیہ تھا۔ اس کے پاس وہ روایتی شعری موضوعات بھی نہیں جو حسنِ فطرت، رومانی محبت اور قدیم وجدید قومی اساطیر سے عبارت ہیں۔ اور بھی بہت کچھ ہے جو جدید شاعر کے پاس نہیں۔ وہ صحیح معنی میں چٹیل میدان پر کھڑا نظم کے گل بوٹے اگانے کی آزمائش جدوجہد میں جتلا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ محولہ بالا جن تین صفات کا میں نے ذکر کیا وہ شاعری سے زیادہ حقیقت پسند افسانہ سے منسلک ہیں۔ شکیل اعظمی کی زیادہ تر نظمیں ماجرائی ہیں۔ ان میں آپ بیتی کا رنگ ہے۔ ایک ایسے نوجوان کے شخصی اور انفرادی تجربات کا اظہار ہے جو وطن سے دور اجنبی لوگوں اور اجنبی سرزمین میں معاشی تگ و دو میں الجھا ہوا ہے۔ یہ جلا وطنی، بے جڑی، اجنبیت، تنہائی میں جینے اور اقتصادی سطح پر استحصالی اور سیاسی سطح پر حیات دشمن پر تشدد معاشرے میں سانس لینے والے نوجوان کا تجربہ کچھ ایسی بے ساختگی اور اثر آفرینی کے ساتھ شکیل کی نظموں میں ظاہر ہوا ہے جس کی مثال جدید شاعری میں کم ہی نظر آئے گی۔

دوسروں سے مفاہمت نہ کرنے میں فرد کی انفرادیت رہی ہے۔ اپنی اندرونی کشمکش ہو یا خارجی دنیا سے پیکار، شکیل کی کوشش سکہ بند رویوں سے بچنے کی ہے۔ شکیل کے چہرے پر کوئی مکھوٹا نہیں، نہ باغی کا نہ انقلابی کا، نہ جدید دور کے تنہا آدمی کا۔ تو پھر اعتمادِ ذات کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اس مشکل سوال کا آسان جواب ہے ان کے شاعر ہونے میں۔ جبرِ حیات ہو یا آلامِ روزگار، انھیں وہ بغیر خود ترحمی کے برداشت کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ وہ ان کی

شاعری کا مواد بن جاتے ہیں۔ گویا تخلیق کا جذبہ زندگی کے کرب کا تریاق بھی ہے اور نعم البدل بھی۔ اسی لئے شاعری ان کے لئے عینِ حیات ہے۔ جو چیز ان کے زخمی وجود اور ریزہ ریزہ شخصیت کو ایک پر انتشار دور کے گردباد میں مشتِ خاک کی طرح بکھرنے سے بچائے ہوئے ہے وہ تخلیقِ فن ہے جو ان کے یہاں ایک حیاتیاتی طاقت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں نرگسیت نہیں، شاعرانہ تعلّی و فخر و مباہات نہیں۔ اپنی فنکارانہ شخصیت اور جمالیاتی احساس کی نمود و نمائش نہیں۔ اس معنی میں یہ شاعرانہ بانکپن اور جمالیاتی کردار کی شاعری بھی نہیں۔ یہ تو جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کٹی پھٹی شخصیت کی شاعری ہے۔ لیکن شاعری کی طرف شکیل کا وہ رویہ بھی نہیں کہ شاعری کی جائے دعوتی کا چتر ہوتے تو کارآمد ہوتے یا کونے کی چال پر بیٹھ جاتے تو ایک بیکار مشغلہ میں زندگی غارت نہ ہوتی۔ شکیل کو اس بات کا گہرا احساس ہے کہ شاعری کا جو ملکہ انھیں عطا ہوا ہے وہ فطرت کی تخلیقی قوت کا ہی ہاں اور انسان کی تخلیقی طاقت کی نشانی ہے۔ زمانہ بھلے اسے کچھ نہ دے لیکن اس کے پاس تخلیقی جوہر کا جو سرمایہ ہے اسے وہ گزند بھی نہیں پہنچا سکتا۔ یہ گویا اپنے نفس میں راکھ ہو جانے اور اسی راکھ سے دوبارہ نغمہ ریز ہونے کا عمل ہے۔ اپنی دربدری، زبونی اور بے وقتی کے باوجود حوادث کی سنگ باری میں سربلندی کا اثبات ہے۔ شاعری گویا زندہ رہنے کے ایک نئے قرینہ کا اعلامیہ ہے۔ ایک مادہ پرست، خود غرض، سفاک دنیا میں شعر کے ذریعہ انھوں نے غمِ حیات کا عرفان حاصل کیا ہے۔ شاعری وہ جامِ جہاں نما ہے جس میں وہ زندگی کے حقائق کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ شاعری سے الگ اور اس سے باہر وہ کچھ بھی نہیں۔ ایک حقیر ذرہ ہیں۔

شکیل کی زندگی کو ان کی شاعری نے اور شاعری کو ان کی آوارگی نے سنبھالا ہے۔ آوارگی ذہن کی وہ لطیف کیفیت ہے جس میں بے قرار دل کو قرار آتا ہے۔ آوارگی انھیں بے مقصد مقصدیت کے معنی سکھاتی ہے اور رہبری اور سماجی چودھراہٹ کی مسند سے دور رکھتی

ہے۔ یہ دل کو عقل کی پاسبانی سے کبھی کبھی تنہا چھوڑنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے قبل کہ وہ شاعری کے بارے میں بہت سنجیدہ ہو جائیں اور بڑے مقاصد والی شاعری کرنے لگیں ذہن، احساس اور آبلہ پا قدموں کی آوارگی انہیں پھر زندگی کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ شاعری مدرسوں اور مسندوں پر نہیں چوراہوں اور چوپالوں پر پیدا ہوتی ہے۔ مسندوں پر تو مشاعروں کے صدر الصدور براجمان ہوتے ہیں۔ بے ساختگی اور برجستگی اس آوارگی کا ثمرہ ہے۔ شکیل منصوبہ بند شاعری نہیں کرتے۔ ان کی نظموں سے ان کے عہد کی تاریخ مرتب نہیں ہوتی لیکن آپ بیتی کا پتہ چلتا ہے جو جگ بیتی کا عکس ہوتا ہے۔ کسی بھی بات کو وہ پر تکلف، پچے چبائے شاعرانہ استعاروں کے رکھ رکھاؤ اور گھماؤ پھراؤ کے ساتھ نہیں کہتے۔ ان کے یہاں سادگی میں پرکاری تک نہیں، صرف سادگی ہے۔ دل فریب اور دل گداز۔ اسی لئے ان کی نظمیں جیسا کہ بتا چکا ہوں بادی النظر میں پر فریب نظر آتی ہیں۔ سطحِ آب پر سکون ہے۔ طوفان تو زیرِ آب پلتا ہے۔

شکیل اعظمی کو میں ندا فاضلی اور محمد علوی کے بعد آسمانِ ادب پر ایک نئے ستارے کی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ادب میں تخلیق کی جوت کبھی کبھی ماند پڑ جاتی ہے لیکن بجھتی نہیں جو زبان و ادب اور قوم کی حیات پرور قوتوں کا ثبوت ہے۔ کسی زبان میں اچھے شاعر پیدا ہونا بند ہو جائیں تو سمجھئے کہ یہ زبان کے انجام کا آغاز ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ صلاحیت شاعر میرے لئے ہمیشہ تسکین اور مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ مسرت اور بصیرت کا یہ سرچشمہ کبھی خشک نہ ہو، سدا بہتا رہے اور زبان و ادب کو سیراب کرتا رہے یہ میری دعا ہے۔

یکم نومبر ۱۹۹۹ء (احمد آباد)

وارث علوی

ہے۔ یہ دل کو عقل کی پاسبانی سے کبھی کبھی تنہا چھوڑنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے قبل کہ وہ
شاعری کے بارے میں بہت سنجیدہ ہو جائیں اور بڑے مقاصد والی شاعری کرنے لگیں ذہن،
احساس اور تیلہ پاقہ موں کی آوارگی انہیں پھر زندگی کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ شاعری
مدرسوں اور مسندوں پر نہیں چوراہوں اور پڑپالوں پر پیدا ہوتی ہے۔ مسندوں پر تو مشاعروں
کے صدر الصدور براجمان ہوتے ہیں۔ بے ساختگی اور برجستگی اس آوارگی کا ثمرہ ہے۔ شکیل
منصوبہ بند شاعری نہیں کرتے۔ ان کی نظموں سے ان کے عہد کی تاریخ مرتب نہیں ہوتی
لیکن آپ بیتی کا پتہ چلتا ہے، جو جگ بیتی کا عکس ہوتا ہے۔ کسی بھی بات کو وہ پر تکلف، پیچے
چپائے شاعرانہ استعاروں کے رکھ رکھاؤ اور گھماؤ پھراؤ کے ساتھ نہیں کہتے۔ ان کے یہاں
سادگی میں پرکاری تک نہیں، صرف سادگی ہے۔ دل فریب اور دل گداز۔ اسی لئے ان کی
نظمیں جیسا کہ بتا چکا ہوں بادی النظر میں پر فریب نظر آتی ہیں۔ سطح آب پر سکون ہے۔
طوفان تو زیر آب پلتا ہے۔

شکیل اعظمی کو میں ندا فاضلی اور محمد علوی کے بعد آسمان ادب پر ایک نئے ستارے
کی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ادب میں تخلیق کی جوت کبھی کبھی ماند پڑ جاتی ہے لیکن بجھتی نہیں
جو زبان و ادب اور قوم کی حیات پرور قوتوں کا ثبوت ہے۔ کسی زبان میں اچھے شاعر پیدا ہونا بند
ہو جائیں تو سمجھئے کہ یہ زبان کے انجام کا آغاز ہے۔ اسی لئے ایک صاحب صلاحیت شاعر
میرے لئے ہمیشہ تسکین اور مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ مسرت اور بصیرت کا یہ سرچشمہ کبھی
خشک نہ ہو، سدا بہتا رہے اور زبان و ادب کو سیراب کرتا رہے یہ میری دعا ہے۔

یکم نومبر ۱۹۹۹ء (احمد آباد)

وارث علوی

○

جوالیش ٹرے میں سلگ رہا ہے

میں جس موسم میں پیدا ہوا۔ وہ انسانی رشتوں کی پامالی، مکانوں کی بے رنگی اور
درختوں کی بے لباسی کا موسم تھا۔ میرے لوگوں نے جس درخت پر گھونسلہ بنایا اسے
آندھیوں نے گرا دیا۔ اس سے پہلے کہ مجھے چلنا یا اڑنا آتا، میرے لوگ مجھ سے بچھڑ گئے اور
میں اپنے گھونسلے کے بکھرے ہوئے تنکوں کے ہمراہ موسموں کے عذاب جھیلنے لگا۔
۱۹۸۴ء کا موسم جاتے جاتے مجھے پنکھ لگا گیا۔ میں اپنے پیروں سے گرنے اور سنبھلنے لگا۔
میری زبان لفظ کی مٹھاس اور معنی کی کڑواہٹ سے روشناس ہونے لگی۔ ۱۹۸۵ء چلنے لگا تو اس
نے مجھے آواز دی اور میں اپنے پیروں کی پوری قوت اور جذبوں کی سچائی کے ساتھ اس کا ہم
سفر بن گیا۔ اس سفر میں "دھوپ دریا" میری پہلی سرائے تھی۔ وہاں سے نکلا تو پھر وہی بھٹکاؤ
تھا، وہی خانہ بدوشی اور بے گھری تھی۔ پانچ سال تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر
"ایش ٹرے" کی شکل میں خیمہ زنی نصیب ہوئی ہے۔ میرا تیسرا پڑاؤ کب اور کہاں ہوگا مجھے
نہیں معلوم۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سفر کتنا طویل ہے۔ ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ مگر
میں چلتے رہنا چاہتا ہوں۔ اس سورج کی طرح جسے نہیں معلوم کہ وہ کیوں جلتا ہے اور کب تک
جلتا رہے گا۔ خدائے برتر کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری دیوانگی کی حفاظت کی ورنہ اس

ریگستان میں دور تک چلنا اور وہ بھی ننگے پاؤں، ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

شاعری سے میرا تعلق ایسا ہی ہے۔ جیسا دل کا دھڑکن سے، زندگی کا سانس سے، سماعت کا آواز سے اور چہرے کا شناخت سے ہے۔ میں دھڑکن چاہتا ہوں، سانس چاہتا ہوں، آواز چاہتا ہوں، شناخت چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر میں ادھورا ہوں۔ میں اپنی تکمیل چاہتا ہوں۔ تکمیل ہی میری نجات ہے۔ تکمیل ہی میری ضمانت ہے۔ شاعری میرے زندہ رہنے کا وسیلہ ہے۔ کبھی کبھی جب میری تخلیقیت پر جمود طاری ہو جاتا ہے تو میں مرنے لگتا ہوں۔ مگر پھر یہیں کہیں سے کوئی تخلیقی موج اٹھتی ہے اور مجھے چھو کر متحرک کر دیتی ہے مجھے پانی پر بنی تصویر پسند نہیں جسے ہوا کا ایک معمولی جھونکا بگاڑ دیتا ہے مجھے آئینے میں ابھرنے والا عکس پسند نہیں جو اپنے اصل کی غیر موجودگی میں زندہ نہیں رہتا۔ مجھے پتھر پر لکھا ہوا حرف پسند ہے جو پتھر کا حصہ بن جاتا ہے۔ میری شاعری اپنی ذات میں قدرت کی تلاش کا ذریعہ اور اس کی تنظیم کا احساس ہے۔ غیب کے الہام کا سلسلہ ہے۔ انسانوں کے دکھوں میں آنکھوں سے بہنے والے آنسو کی زبان اور خوشیوں میں کھل اٹھنے والے ہونٹوں پر خوشبو کا ذائقہ ہے۔ موسموں کے ہاتھوں ویرانی اور شادابی کے درمیان کھنچی ہوئی لکیر پر بیٹھے ہوئے پرندوں کے کرب کا اظہار ہے۔ پانی میں نہاتے ہوئے چاند کی بے آبی کا شکوہ اور سورج کی زندگی میں شام کی دخل اندازی کا مرثیہ ہے۔

شاعری میں دو دو چار کا جوڑ بھی چلتا ہے اور چار میں سے دو کو گھٹایا بھی جاتا ہے۔ یہ اور بات کہ اس حساب کتاب والی شاعری سے میرا جذباتی لگاؤ کبھی نہیں رہا۔ لیکن ایک اچھا اور سچا شعر لہو کے تال پر کب اور کیسے تھرکتا ہے، ایک خوبصورت نظم تخلیق کے پیکر میں ڈھلنے سے پہلے کتنا خون پیتی ہے اس کا ادراک مجھے ہے۔ کہ میں تخلیقی موڈ کے عروج و زوال اور اس کے سکھ دکھ میں شامل رہا ہوں۔ میری شاعری میرا آج ہے میرے وجود کی طرح، میں جو ہوں وہی ہوں۔ میری شاعری بھی وہی ہے۔ اسی لئے اس کا محاسبہ بھی میں نے اپنی مٹی میں رہ کر ہی کیا ہے۔ آپ کی پسند یا ناپسند میرے لئے یوں بھی محترم نہیں، کہ میں کوئی پروفیشنل

ڈیزائنر نہیں، شاعر ہوں۔

ندا فاضلی کے گھر کے سامنے والی املی پر بیٹھے ہوئے بھوت کی خاموشی ہو یا میرے مکان کے سامنے والی املی سے اڑنے والے سانپ کی آواز، دونوں کے خوف کا احساس ایک جیسا ہے۔ ندا فاضلی کا گوالیار سے بھوپال، بھوپال سے دلی، دلی سے ممبئی تک کا بھٹکاؤ میری اعظم گڑھ سے بڑودہ، بڑودہ سے بھروچ، بھروچ سے سورت اور سورت سے ممبئی کی طرف نکل پڑنے کی دیوانگی سے مختلف نہیں ہے۔ ہمارے دکھوں کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ندا فاضلی مجھ میں، میں ندا فاضلی میں سانس لیتا ہوں۔ اس کتاب کا انتساب ندا فاضلی کے نام کر کے میں نے اپنے آنسو اپنے ہی دامن میں جذب کئے ہیں۔

۹ر ستمبر ۱۹۹۹ء سورت

شکیل اعظمی

○

یہ دور وہ ہے، کسی کو قبول کوئی نہیں
لہو لہان سبھی ہیں رسول کوئی نہیں

گزشتہ دھوپ میں آنکھوں کے سوتے سوکھ گئے
کسی کے واسطے اب کے ملول کوئی نہیں

بدن کی آگ بدن ہی میں جلتی بجھتی ہے
یہ کیسا قرض ہے کرتا وصول کوئی نہیں

مجھے نہ توڑ، کہ آگے خزاں کا موسم ہے
مرے علاوہ ترے بَن میں پھول کوئی نہیں

عجیب رُت ہے ہوائیں بھی خیمہ زن ہیں شکیل
اڑانے والا بیاباں میں پھول کوئی نہیں

سفر ہے شرط، کسی سمت کو نکلتے رہو
صلہ ملے نہ ملے راستے پہ چلتے رہو

○

تم کیا ملے، کہ ہم بھی غزل یار ہوگئے
دوچار شعر کہہ کے زمیندار ہوگئے

سورج سے میں نے ہاتھ ملا کر بُرا کیا
سائے سبھی مکان کے اُس پار ہوگئے

ٹکرا گئی تھی یونہی ہوا بادبان سے
کشتی کے سارے لوگ خبردار ہوگئے

جنگل کٹے تو رات مکانوں میں آگھسی
رستے تری گلی کے پُر اسرار ہوگئے

رنگوں کے بعد نور عمارت میں کھوگئی
بادل زمیں پہ ٹوٹ کے بیکار ہوگئے

اب کشتیوں کا تیرتے رہنا محال ہے
ساحل ندی میں ڈوب کے جی دار ہوگئے

کھیتوں میں اینٹ بونے کا دستور چل پڑا
اب چھوٹے موٹے گاؤں بھی بازار ہوگئے

○

رستہ لمبا ہو، تو پیادہ مت کرنا
گھر آنے میں رات زیادہ مت کرنا

ورنہ دریا گھس آئے گا کمرے میں
جانے کا اُس پار ارادہ مت کرنا

بلب بہت کمزور ہے میرے کمرے کا
بجلی کی مقدار زیادہ مت کرنا

تم تو خود کو مار چکے، پر بچوں کو
میر کے جیسا سیدھا سادہ مت کرنا

آسمان سے جانے اب کے کیا ٹوٹے
تاریکی میں ہاتھ کشادہ مت کرنا

جاؤ، خود کو روشندان پہ رکھ آؤ
لیکن دیواروں میں جادہ مت کرنا

○

دیواروں سے دروازے تک آیا ہوں
گرتا پڑتا اندازے تک آیا ہوں

سیدھے سادے رستے مجھ سے بدظن ہیں
غلطی کر کے خمیازے تک آیا ہوں

خاموشی کے ساتھ نکلنا مشکل تھا
شور مچا کر آوازے تک آیا ہوں

گھر کی مٹی کی عظمت میں کتنی بار
ننگے پاؤں بھی دروازے تک آیا ہوں

شور بدن کا پھیل رہا ہے کمرے میں
لمس پکڑ کر شیرازے تک آیا ہوں

○

رات بہت لمبی ہے، کمرہ چھوٹا ہے
رستہ دروازے تک پھیل کے سویا ہے

تنہائی محدود نہیں دیواروں تک
گھر کے باہر بھی گہرا سناٹا ہے

منظر کی پہچان یہاں ہے موسم بھر
آنکھوں کے اس پار اندھیرا رہتا ہے

سائے سب دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے
سورج اب تنہا ہی آتا جاتا ہے

چٹانیں سب ڈوب چکی ہیں پانی میں
دریا بے آواز یہاں سے بہتا ہے

○

کوئی تو ہو جو سفر کی تھکان لے جائے
بدن کی فصل پکے تو لگان لے جائے

کبھی کبھار ہمیں بھی کسی پری کی طرف
کوئی کہانی کوئی داستان لے جائے

ذرا سا ٹھہر کے آنکھوں میں کوئی جاتے وقت
تمام جسم سے امن و امان لے جائے

رہے جو بند تو کھڑکی کے پیچھے کچھ بھی نہ ہو
کھلے تو صرف تری سمت دھیان لے جائے

زمین جا کے بلا لائے آسماں کو کبھی
زمیں کو آ کے کبھی آسمان لے جائے

غرض تو صرف ہوا سے ہے سمت کوئی ہو
جدھر بھی چاہے ہمیں بادبان لے جائے

ہماری ناؤ کے نیچے ہے جو وہی پانی
لہو کے پاس سے گذرے تو جان لے جائے

○

کبھی کبھی جو تو بیگانہ لگنے لگتا ہے
تمام شہر ہی ویرانہ لگنے لگتا ہے

سروں کی بھیڑ میں خود کو چھپا کے رکھ، ورنہ
بلند ہونے سے پیمانہ لگنے لگتا ہے

عجیب شہر کا ماحول ہے، کہ شام ڈھلے
مکاں سے نکلو تو جرمانہ لگنے لگتا ہے

یہی وہ رُت ہے کہ خیمے اجاڑنے کے لئے
ہوا کے ہاتھ میں دستانہ لگنے لگتا ہے

کسی کے لمس کو محسوس کرکے دیکھ ذرا
تمام جسم ہی میخانہ لگنے لگتا ہے

○

لوگوں میں تھوڑی پہچان ضروری ہے
سرداری میں اک کرپان ضروری ہے

دونوں آنکھیں ساتھ میں لے کے مت جاؤ
دروازے پر اک دربان ضروری ہے

جنگل ہے تو آدی واسی بھی ہوں گے
جان مال کا تھوڑا دھیان ضروری ہے

نیپالی لڑکی کا پیچھا کرنے میں
پربت کے رستوں کا گیان ضروری ہے

سچائی لازم ہے کالے دھندے میں
بے ایمانی میں ایمان ضروری ہے

○

بکھرتا ہوں اجالے مکاں کے باہر بھی
مرا سفر ہے مرے کارواں کے باہر بھی

نہ جانے کتنی کمانیں کھنچی ہیں مجھ پہ، مگر
میں سر سمیت ہوں جائے اماں کے باہر بھی

ندی سے نکلے تو آندھی نے آلیا ہم کو
وہی بہاؤ ہے آبِ رواں کے باہر بھی

وہ نام حرف سے تبدیل ہو کے چہرے میں
نکل کے آئے کبھی داستاں کے باہر بھی

تمام رات ستاروں کے ساتھ رہتا ہے
کہ چاند آئے کبھی آسماں کے باہر بھی

○

کوئی بھی رسم ہو، سر پہ نہیں اٹھاتے ہم
نماز پڑھتے ہیں ٹوپی نہیں لگاتے ہم

جو آب پڑتا ہے خود ہی میں جذب کرتے ہیں
بدن کو دھوپ میں رکھ کر نہیں سکھاتے ہم

دکھوں کو جیتے ہیں اور جی کے خلق کرتے ہیں
اب اپنی موت پہ ماتم نہیں مناتے ہم

سزا ملی ہے ہمیں روشنی میں رہنے کی
کہ سوتے وقت بھی بتیؔ نہیں بجھاتے ہم

ہر ایک راہگذر تیرگی میں ڈوبی ہے
چراغ گھر سے نکل کر نہیں جلاتے ہم

○

غلط ہوا کہ فلک کو خفا نہ کرتا تھا
زمیں کے حق میں ہمیں فیصلہ نہ کرتا تھا

خیال رکھتا تھا سورج کی آگ کا ہم کو
بلند اتنا بھی دستِ دعا نہ کرتا تھا

اب اس سے رسم دعا و سلام بھی نہ رہی
تعلقات میں اتنا خلا نہ کرتا تھا

اے زندگی! جو تجھے مارنا ہی تھا مجھ کو
تو پال پوس کے اتنا بڑا نہ کرتا تھا

شکست اس کا مقدر تھی، ورنہ رستے میں
میں گر گیا تھا تو اس کو کھڑا نہ کرتا تھا

○

ابھی مرا تھا، ابھی مر کے جی اٹھا ہوں میں
جہاں کٹا تھا وہیں سے پنپ رہا ہوں میں

مری صدا ہی مری نیند توڑ دیتی ہے
نہ جانے خواب میں کس کو پکارتا ہوں میں

خیالِ یار ہے اک بحرِ بیکراں کی طرح
ذرا سا سوچا تھا اور ڈوب سا گیا ہوں میں

غلط ہے مجھ سے یہ ترتیبِ روشنی کا گلہ
کہ شام ہی سے ہواؤں میں جل رہا ہوں میں

سمیٹ رکھا ہے دشمن نے مجھ کو ہاتھوں میں
کہ اپنی پیٹھ کے پیچھے بندھا ہوا ہوں میں

سفر ہے خواب کا آنکھیں چھپا کے چلتے ہیں
کہ پانیوں پہ سہارے ہوا کے چلتے ہیں

عجیب رسمِ ہوس ہے، کہ لوگ ہجرت میں
سروں پہ گھر نہیں، پتھر اٹھا کے چلتے ہیں

وہی ہے پیاس، وہی جنگ حق و باطل کی
رواج اب بھی وہی کربلا کے چلتے ہیں

یہ آسماں کا علاقہ ہے، ہاتھ باندھے رہو
تمام حکم یہاں پر خدا کے چلتے ہیں

مکان اوڑھے رہو برف برف موسم ہے
گلی میں چار سو نیزے ہوا کے چلتے ہیں

مجھی پہ ٹوٹ پڑی خامشی زباں بن کر
ہر ایک سمت سے پتھر صدا کے چلتے ہیں

○

برف پگھلے، کہ ذرا راستہ ہونے لگ جائے
دھوپ مل کر مرے احساس سے رونے لگ جائے

کوئی منظر کوئی تصویر بنے آنکھوں میں
کوئی بادل مری دیوار بھگونے لگ جائے

دل کی دھڑکن بھی سنائی نہیں دیتی اب کے
تیری یاد آئے کوئی چیز چبھونے لگ جائے

ایسی سردی ہے کہ اس بار مرے ہاتھوں سے
ڈر رہا ہوں کہ ترا لمس نہ کھونے لگ جائے

یا تو اب ختم ہو بہتے ہوئے پانی کا سفر
یا کوئی موج مری ناؤ ڈبونے لگ جائے

○

ہوائے شام سے دیوار میں شگاف آیا
بدن میں جتنا اندھیرا تھا زیرِ ناف آیا

یہ تجربہ بھی ہوا سردیوں کی راتوں میں
میں سو گیا تو مجھے اوڑھنے لحاف آیا

کئی گناہ مری صحبتوں میں تھے، لیکن
نکل کے مجمعِ شب سے میں صاف صاف آیا

اسے قبول ہیں آوارہ گردیاں میری
کہ میرے حصے میں پھر موسمِ طواف آیا

چلو یہ بند بھی ٹوٹا، کہ آج میرے نام
موافقین کی جانب سے اختلاف آیا

○

انسانیت کو خیر نہیں، شر بھی چاہئے
نیزے کی پرورش کے لئے سر بھی چاہئے

خوش فہم ہوں بہت کہ مرا قد بلند ہے
اک آسمان میری زمیں پر بھی چاہئے

ہونٹوں کے بعد ذائقۂ روح کے لئے
اک جام لب کے زہر ملا کر بھی چاہئے

یہ سوچ کر زبان بھی کانٹوں کو سونپ دی
اے لہجۂ غزل! تجھے تیور بھی چاہئے

ہم موم جسم لوگ کہاں دھوپ میں پھریں
دل جیسی نرم چیز کو کچھ ڈر بھی چاہئے

یارب! ترے مکان کے اطراف پھر چکے
دستک کہاں لگائیں کہ اک در بھی چاہئے

جنگل کا مور ناچ بہت ہو چکا قتیلؔ
وحشت کی ارتقا کے لئے گھر بھی چاہئے

○

تمام شہر پہ اک انجماد رہتا ہے
ترا وجود بھی اب کس کو یاد رہتا ہے

عجب نہیں مرا فرقہ پرست ہو جانا
مری گلی میں مسلسل فساد رہتا ہے

الگ الگ ہیں سبھی بھائیوں کے دروازے
مگر لہو میں بڑا اتحاد رہتا ہے

کوئی بھی رُت ہو کھلی کشتیوں میں پھرتے ہیں
ہمیں بھی خود پہ بہت اعتماد رہتا ہے

ہماری سوچ ہی کچھ مختلف ہے لوگوں سے
ملاپ میں بھی ذرا سا تضاد رہتا ہے

○

سفر ہے شرط، کسی سمت کو نکلتے رہو
صلہ ملے نہ ملے راستے پہ چلتے رہو

شناخت کے لئے قربانیاں ضروری ہیں
چراغ بن کے کسی رہگذر پہ جلتے رہو

اسی کے ہو رہو جو چیز دل کو بھا جائے
کسی بھی طرح کسی شغل سے بہلتے رہو

سفید رُت ہے کہیں خون ہی نہ جم جائے
بدن جلاؤ اسی آگ میں پگھلتے رہو

عذاب یہ بھی ہمارے ہی سر اترنا تھا
کہ شہر ہی میں رہو اور گھر بدلتے رہو

○

ہمی کو نقش بنانے پڑے، مٹانے بھی
زمانہ آیا نہیں انگلیاں اٹھانے بھی

شکار گاہ سے لوٹے تو ہاتھ خالی تھے
کہ جن پہ ناز تھا چوکے وہی نشانے بھی

حساب مانگنے آیا تھا آسماں اک دن
زمیں کو ڈھونڈ کے لانے پڑے بہانے بھی

کوئی سبب تو نہ چھاؤں سے نکلنے کا
ہوا درختوں کو آئے کبھی گرانے بھی

میں اپنی آنکھ لئے لوٹ آیا منظر سے
عجیب لوگ تھے آئے مجھے منانے بھی

امیر ہوگئی دنیا تلاش کرکے مجھے
جہاں میں دفن تھا نکلے وہیں خزانے بھی

○

جلا کے یونہی چراغ نام و نسب رکھا تھا
ہوا کے آنے کا جھوٹا سچا سبب رکھا تھا

کچھ اس طرح بھی میں اپنی بستی میں منفرد ہوں
قبیلے والوں نے نام میرا عجب رکھا تھا

جہاں سے خود کو بچا کے ہم لوگ لوٹ آئے
وہیں کہیں پہ خدا نے اپنا غضب رکھا تھا

تمام بازی اسی نے جیتی یہ بات سچ ہے
شکستگی کا ملال ہم نے بھی کب رکھا تھا

تمہاری آنکھوں سے لے کے سورج کے ڈوبنے تک
کئی دنوں تک حساب ہم نے بھی سب رکھا تھا

ایش ٹرے

مرے عزیزو!
مری کہانی
تمہارے نازک لبوں
چمکتے سفید دانتوں
چہکتی صبحوں
مہکتی شاموں سے
ماورا ہے
نہ مجھ میں رنگوں کے میوزیم ہیں
نہ دیو پریوں کی داستانیں

یہ جلتی بجھتی سی راکھ
سگرٹ کے چھوٹے چھوٹے ہزاروں ٹکڑے
کہ جن پہ چل کر تم آرہے ہو
یہی علامت ہیں زندگی کی
جنھیں میں قسطوں میں مر چکا ہوں
مگر یہ طے ہے
جب اس کی خوشبو
تمہارے نتھنوں کو چھوتے چھوتے
تمہاری روحوں سے جا ملے گی
یہ زہر پینا پڑے گا تم کو
جو ایش ٹرے میں سلگ رہا ہے

پہچان

میرے اپنو!
ہماری کئی پشتوں نے
پھاوڑے
ہل
اور ہل کے اطراف ہی
گھوم کر تن چھپائے
مگر پیٹ کی آگ بجھ نہ سکی
اور خود وہ زمیں کی غذا بن گئے
جن کے ناموں کی اب تختیاں بھی
جو ڈھونڈو تو ملتی نہیں
جن کی قبروں کے نام و نشاں مٹ چکے
اور جنھیں اب کوئی جانتا تک نہیں

تم زمینوں کے موسم میں کھوئے رہے
اور کنوئیں سے نکلنے کی کوشش نہ کی
تم نے لفظوں پہ بھینسوں کو ترجیح دی
اور پاگل کہا تم نے مجھ کو
کہ میں
سوچتا ہوں بہت
یہ قلم
جو مری زندگی ہے
جسے تم مرے ہاتھ سے چھیننے آئے ہو
چھین لو
ختم کر دو مجھے
اس سے پہلے مگر سوچ لو
میں تمہارے بھی
زندہ اور مردہ لوگوں کی پہچان ہوں

دوسرے اور تیسرے دن کے درمیان

جیون پتھ پر
کل سے اب تک
کتنے لوگ ملے بچھڑے ہیں
کچھ اپنے سے
کچھ بیگانے
لیکن سب کے سب جھوٹے تھے
کوئی سچا نام ملے تو
ٹانک لوں اس کو ہونٹوں پر
تیسرے دن کی تیاری میں
آج بھی سورج ڈوب رہا ہے
اندر سے کچھ ٹوٹ رہا ہے

ندا فاضلی کے نام !

میں ایسا بیج!
جو خود اپنے ہی لہو میں سڑا
کسی نے بویا نہیں مجھ کو اپنی مٹی میں
زمین پر نہیں
چٹان پر اگا ہوں میں
نہ بادلوں نے مرے لب بھگوئے بارش میں
نہ سردیوں سے مری دھوپ نے حفاظت کی

گرانے آئیں کئی بار آندھیاں مجھ کو
مرے خلاف بہت موسموں نے سازش کی
مگر کھڑا ہی رہا میں اکھڑتے پیروں سے
کچھ ہی دنوں میں مرے رنگ روپ یوں بدلے
چٹان مجھ میں
میں چٹان میں اترتا گیا
اب آسماں مری شاخوں کو چھونا چاہتا ہے
زمین میرے تنے سے لپٹنا چاہتی ہے
مگر میں خود کو چٹانوں پہ توڑ دیتا ہوں
سکون ملتا ہے جذبوں کو رائگاں کر کے
زمین!
تجھ سے یہی انتقام ہے میرا

میرا گھر

جانے کب سے بھیگ رہا ہوں
یاد نہیں
بارش اور بدن کے بیچ اندھیرا ہے
آنکھیں بند پڑی ہیں
پھر بھی
اندازے سے دیکھ رہا ہوں
دور بہت اک مٹی کا گھر
جیسے اب گرنے والا ہے
اچھا ہے کہ دروازے پر تالا ہے
گلیاں سب ویران پڑی ہیں
باہر کھیلنے والے بچے
اپنے اپنے گھر دبکے ہیں
گائے، بھینس اپنی ناندوں میں
منہ لٹکائے
مستی سے جگالی ۱؎ کرتی ہیں

لیکن بیٹھک میں
اک کونے
لنگڑی کتیا اونگھ رہی ہے
اس کی حالت
گھر کی حالت
اک جیسی ہے
گھر گر جائے تو میں اپنی آنکھیں کھولوں
اپنے آپ کو ملبے سے باہر لے آؤں
جشن مناؤں
لنگڑی کتیا کے مرنے کا

۱؎ جگالی

ضرورت

باہر تو بارش بھی نہیں ہے
لیکن چھت سے
پانی سا کچھ ٹپک رہا ہے
وہ بھی
شرٹ کی جیب میں
جس میں
بیڑی اور ماچس رہتی ہیں
دونوں سالی بھیگ چکی ہیں
ہونٹوں کا اک کالا پن ہے
جو کمرے میں ناچ رہا ہے
دروازے کو پیٹ رہا ہے

بارش

بارش سے
کھیتوں میں فصلیں آتی ہیں
لیکن زیادہ ہو تو
فصلیں گر جاتی ہیں
جیتے جی مر جاتی ہیں

جمود کا موسم

سورج!
اپنے سارے وصف گنوا بیٹھا ہے
صبحیں
شامیں
اندر رد عمل کے
اور شفق کے ماتم میں
اکثر گھر پر ہی رہتی ہیں
ایک سفیدی ہے جو چاروں اور جمی ہے

جس کی تہہ میں
پچھلا موسم
اپنی دھوپوں کو دفنا کر
دور کہیں مفلوج کھڑا ہے
رستوں پر گھاس اگ آئی ہے
ایسے میں
کچھ زندہ لوگ
اپنا اپنا جسم جلا کر
تاپ رہے ہیں

میں سورج نہیں ہوں

آندھیاں
مجھ کو چھت سے گرا کر
بہت خوش ہوئی ہوں گی
اور سوچتی ہوں گی کہ
مر چکا ہوں گا میں
الگنی سے جو کپڑے گلی میں گرے
سب مرے تھے
مگر ان میں میں تو نہ تھا

میرا ننگا بدن
باتھ ٹب میں تھا
اور
زندگی میری مضبوط بانہوں میں تھی
گیلے کپڑوں میں جو لاش تھی
جلتے سورج کی تھی
شام!
سورج کو
دفنا کے گھر آئی تو
میں نے مٹی لگی مٹھیاں دھوئیں
کمروں کو روشن کیا
اور پھر
اپنے ہاتھوں سے ہی
بلب توڑے سبھی
اپنے مرنے کا ماتم کیا
اور پھر
کچھ کسی سے بتائے بنا
جا کے سورج ہی کی قبر میں
صبح تک کے لئے مر گیا

کہانی کا ادھوراپن

مری ماں!
قبر سے گھر آگئی ہے
درو دیوار روشن ہو گئے ہیں
چھتوں سے جھولتی مکئی کی بالیں چہچہاتی ہیں
مری نانی بہت خوش ہیں
مٹھائی بانٹتی ہیں
مٹھائی!
جو بدائی میں فرشتے لے کے آئے ہیں
ممانی چولھے پر بیٹھی ہوئی ہیں
مرا کھانا نکالا جا رہا ہے
میں ماں کی گود میں بیٹھا کہانی سن رہا ہوں

مگر تکمیل سے پہلے
سڑک پر بھونکتے کتوں کی آوازیں
مرے کانوں میں چبھتی ہیں
میں ڈرتا ہوں
جھجکتا ہوں
جلا کر بلب کمرے سے اندھیرے کو بھگاتا ہوں
کھلی آنکھوں سے خود کو دیکھتا ہوں
اور روتا ہوں
نہ میرا گاؤں ہے
نہ گھر ہے
نہ مکئی کی بالیں ہیں
فرشتے ماں کو واپس قبر میں دفنا چکے ہیں
یہاں کوئی نہیں ہے
صرف میں ہوں
میرا کمرہ ہے
کہانی کا ادھوراپن
مری آنکھوں میں بکھرا ہے

آخری دعا

آسمانوں پہ صرف بادل تھے
دور تک روشنی کا نام نہ تھا
کالے موسم کا راج تھا ہر سو
آنکھ چہرے سے کھو گئی تھی کہیں
ہاتھ بھی ڈھونڈنے سے ملتے تھے
سلسلہ وار تیز بارش سے
میں نے گھبرا کے ہاتھ اٹھائے تھے
اور سورج سے دھوپ مانگی تھی
دھوپ نکلی تو کھیت سوکھ گئے
اور آنکھوں میں دھول اڑنے لگی
زندگی چاہے جس لباس میں ہو
اس کی عریانیت نہیں جاتی
اب یہ سوچا ہے کوئی موسم ہو
عافیت کی دعا نہ مانگوں گا

میں بزدل ہو گیا ہوں

مجھ سے روٹھے ہیں میرے سارے خواب
وہ مرے خواب!
جو منزل ہیں مری
سالہا سال میں بھٹکا جنھیں پانے کے لیے
وہ اندھیرا!
کہ جہاں سے مرے خوابوں کی صدا
میرے کانوں سے ذرا پہلے ہی ٹکرائی تھی
اور آنکھوں کو نظر آئی تھی پرچھائیں سی
اس سے پہلے
کہ وہ پرچھائیں نمایاں ہوتی
اور آواز کی سمتوں کا پتہ چلتا مجھے
اک اجالا سا کہیں سے لپکا
اور اندھیرے سے بہت دور چلا آیا میں

اب مری سوچ

میری آزادی

گروی رکھی ہے سورجوں کے یہاں

وہ جو کہتے ہیں

وہی سنتا ہوں

وہ جو کہتے ہیں

وہی کرتا ہوں

مجھ میں جو "میں" تھا

مر چکا ہے اب

میرے دن رات، میرے نہیں ہیں

بارہ گھنٹے ڈیوٹی کر کے

رات کا کھانا وانا کھا کر

تھوڑا پیدل چلتا ہوں

روم پہ آتا ہوں تو

پونے دس یا دس بج جاتے ہیں

کپڑے کھونٹی پر لٹکا کر

لنگی اور بنیان میں لیٹا سوچتا ہوں

(رہ رہ کر سگریٹ بھی سلگا لیتا ہوں)

ٹی وی پر میچ آتا ہوگا

بنگالی کے پاس کلر ٹی وی بھی ہے

کیوں نہ اس کے روم پہ جا کر دیکھ آؤں

لیکن میچ میں ڈیڑھ یا دو بج جائیں گے

صبح میں ڈیوٹی بھی کرنی ہے

میچ تو یوں بھی کل اخبار میں آ جائے گا

ٹھیک ہے پھر گھنٹہ دو گھنٹہ کچھ پڑھ لوں

نئے رسالے باری باری اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہوں
پھر رکھ دیتا ہوں
جانے دو پھر پڑھ لوں گا
پہلے خط نسرین[1] کو لکھ دوں

اس کا خط آئے دو ہفتے بیت گئے
بچاری کیا سوچتی ہو گی ؟
غصے میں بچوں کو ڈانٹتی مارتی ہو گی
کل میری تنخواہ کا دن ہے
کل ہی جا کر منی آرڈر بھی کر دوں گا
سوٹ کیس میں فارم پڑا ہے
ابھی سے بھر کر رکھ لیتا ہوں
پوسٹ آفس کا کیا ہے
فارم نہیں بھی ہو ؟
پچھلی بار تو انتر دیشی، ٹکٹ، لفافہ بھی غائب تھا
یہ سالے سرکاری شعبے سب ایسے ہی چلتے ہیں
سرکاری لوگوں کو ہماری حیرانی سے کیا مطلب ؟
بوڑھے اپنی کرسی پر آرام سے بیٹھے اونگھتے ہیں
کم عمروں والے اپنے اسٹاف کی لڑکی سے ہنستے ہیں
مزے سے باتیں کرتے ہیں

کائنات[2] کا جنم داخلہ تین مہینے سے اٹکا ہے

جب جاؤ بس اک عرضی لکھوا لیتے ہیں
کارڈ ملے تو جان چھٹے
اب کی بار نہیں ملا تو
جھگڑا بھی کر دیکھوں گا
سیدھے پن سے کوئی کام نہیں ہوتا
سامنے کی دیوار گھڑی میں بارہ بج گئے
ابھی دوا بھی کھانی ہے
سر پر تیل بھی رکھنا ہے
(یہ موسم کی تبدیلی بھی بیماری کا گھر ہوتی ہے)
چھوڑو اب خط کل لکھوں گا
بستر کر کے سو جاتا ہوں
صبح کو ڈیوٹی پر جانا ہے

سگرٹ روئی تک جل بجھ کر یونہی پڑی ہے
اس کا دھواں پنکھے کی ہوائیں مجھ سے زیادہ پیتی ہیں

---

[1] میری بیوی [2] میری بیٹی

ایک نظم

نوکری کرکے اوب چکا ہوں
دنیا بھر کی پابندی
اور جیبیں خالی
اب کی دیوالی سے پہلے
بارش کے جاتے جاتے
چھوٹا ہی پر اپنا کچھ دھندہ کر لوں گا
دیوالی میں مٹی بھی بک جاتی ہے
نوٹ کما کر کلکتہ جاؤں گا
کچھ دن عیش کروں گا
وہیں سے اعظم گڑھ جاؤں گا
بیوی بچوں کو خوش کر کے
پھر نیپال چلا جاؤں گا
یہ نیپال بھی خوب جگہ ہے
ہرے بھرے جنگل
جنگل میں
آدیواسی نیپالن

دور دور پر اکا دکا چھوٹے چھوٹے لکڑی کے گھر
آسمان سے باتیں کرتے اونچے پربت
پربت پر برفیلے موسم
بچوں کی سی کلکاری میں اوپر سے گرتے جھرنے
جھرنوں کے پانی سے کھیلتے عریاں جسم
جسموں کے ہر حصے سے اگ اُگتا چاند
ایک دوسرے کو تکتے، شرماتے چہرے
ہر منظر تصویر کے جیسا لگتا ہے
سالا یہ نیپال بھی جیسے تصویروں کا البم ہے
کھولتے جاؤ
دیکھتے جاؤ
چہرے ختم نہیں ہوتے
جی کرتا ہے
بڑے سے اس البم میں
میں بھی
اپنی اک تصویر لگا دوں
یہاں کی ساری تصویروں سے
خود کو ہم رشتہ کر لوں
ان کے ہی رنگوں میں میں بھی رنگ جاؤں

رات میں کھلنے والے پھول

جہاں میں ہوں
وہ پورا ایریا مسجد کے جیسا ہے
کئی کچ پچ کی مسجد ہیں
لوائیں اوڑھی جاتی ہیں
نمازیں پہنی جاتی ہیں
کئی بچے یہاں قرآن کی تعلیم پاتے ہیں
یہ سب مجھ کو بھلا لگتا ہے
لیکن میں
پرندوں کی طرح
مسجد کے باہر ہی
خدا کی عظمتوں کے گیت گاتا ہوں
مری نظمیں
مری مٹی سے اٹھ کر
چومتی ہیں آسماں کو
اور خدا سے بات کرتی ہیں
طریقِ بندگی میرا جدا ہے عام لوگوں سے

جہاں میں ہوں وہ پورا ایریا مسجد کے جیسا ہے
اسی میں اک دکاں ہے
ایک کمرہ
اور دو گھر ہیں
یہ گھر سیٹھوں کے ہیں
کمرہ مری نیندوں کا مرکز ہے
میں دن میں اپنی آزادی کا سودا کر کے
شب بھر جاگتا ہوں
نظم لکھتا ہوں
دنوں کے زخم راتوں کے اکیلے پن میں کھلتے ہیں
مرے اندر مہکتے ہیں
میں جن لوگوں میں رہتا ہوں
وہ پکے مذہبی ہیں
اور نمازی بھی
مگر گاہک بڑے ہوں تو
نمازیں چھوٹ جاتی ہیں
یہاں پیسہ ہر اک رشتے سے افضل ہے
ہزاروں جھوٹ، مکاری، سیاست
روز کا معمول

مرا دم گھٹتا رہتا ہے
مگر خاموش رہتا ہوں
یہاں پر کلمہ گوئی سے کوئی بھائی نہیں ہوتا
کئی خانے ہیں
جن میں ذات کی تقسیم ہوتی ہے
فقیر
حجام
جولاہے
حقیر اور دوسرے درجے کے مسلم ہیں
یہاں پر شاعری معیوب ہے
شاعر دہریا ہے
مری مے نوشی سے
ان کے پیالوں اور گلاسوں میں غلاظت بھر گئی ہے
مرے برتن الگ ہیں ان کے برتن سے
مگر اب بھی
کئی مے نوش
ان کے برتنوں میں کھاتے پیتے ہیں
جو میرے جیسے ہی انسان ہیں
لیکن

بڑے عہدوں پہ فائز ہیں
میں اس ماحول سے گھبرا گیا ہوں
اور بغاوت کرنے والا ہوں
مری آزادی
میری زندگی ہے
اب اپنی زندگی میں خود جیئوں گا
مرا میخانہ اس مسجد سے اچھا ہے
خدا دوکان کے بیوپار میں
گھر کی ضرورت میں نہیں ہے
خدا بھٹکاؤ ہے
آوارگی ہے
جستجو ہے
مرے کمرے کے دروازے کا تالا ٹوٹنے کو ہے
مری دیوانگی کمرے سے باہر آنے والی ہے

بیسویں صدی کی قبر پر

سو سوچے پیدا کرنے والی ماں!
تو کتنی تنہا لگتی تھی
گھر کے اک کونے میں چھپکی رہتی تھی
بوجھ تھا کتنا تیرے ہڈی کے ڈھانچوں پر
تیرے لوگ ہی تیری بھاشا سے انجان
تیرا پہناوا ان کے کپڑوں سے الگ
میں تیرے دکھ سمجھ رہا ہوں
ہجولی ہوں تیرے انتیس بیٹوں کا

تو گھر، آنگن، کھیتوں اور کھلیانوں والی
بھولی عورت
پنگھٹ پر بل کھانے والی چنچل لڑکی
گھونگھٹ میں شرمانے والی پیاری دلہن
رات رات بھر جاگنے والی اچھی ماں
تیرے بیٹے ایٹم بم سے کھیل رہے ہیں
پاؤں تلے بارود بچھا کر ناچ رہے ہیں
سب کو نفرت بانٹ رہے ہیں
کتنا فرق ہے تجھ میں اور تیرے بیٹوں میں
مجھ کو ڈر ہے، تیرے بیٹے
دنیا جیتنے کے چکر میں
دنیا ہی کو ختم نہ کر دیں
اچھا ہے جو تو مر گئی
اپنوں کے مرنے سے پہلے
دنیا کے مٹنے سے پہلے
میں تیرے مرنے سے خوش ہوں

اکیسویں صدی کی پیدائش پر

جانتا ہوں
سو سال ملا جیون تجھ کو
صحت بھی تیری اچھی ہے
لیکن پھر بھی
مجھ کو تیری لمبی عمر پہ شبہ ہے
ایسی دنیا
جہاں گناہوں کے سیلاب ہیں چاروں سمت
مہنگائی ہر شئے پر سانپ بنی بیٹھی ہے
آدمی آدمی کا دشمن ہے

بھاشا، مذہب، رنگ، نسل کے جھگڑے ہر جانب پھیلے ہیں
ملک ملک میں خانہ جنگی
سرحد، سرحد جنگوں کی تیاری ہے
گاہے گاہے آسمان سے عذاب اترتے رہتے ہیں
گھر گھر بیماری پھیلی ہے
ایسے میں تیری صحت بھی کب تک اچھی رہ سکتی ہے ؟
روگ لگیں گے تجھ کو بھی
تو بھی ہم لوگوں کی طرح
وقت سے پہلے مر جائے گی

جوکر

تاش کے باون پتے ہیں
سب کے سب کھیلے جاتے ہیں
بس اک جوکر ہے
جو بیٹھا
ہر پتے کا منہ تکتا ہے
سوچتا ہے
ان میں سے کوئی اک پتہ
پھٹ جائے
یا
گم ہو جائے
اپنا بھی نمبر لگ جائے

سیلز گرل

ایک بڑا سا مارکیٹ ہے
مارکیٹ میں ایک دکاں ہے
جس پر میں بیٹھا رہتا ہوں
سامنے ہی اک اور دکاں ہے
جس میں پھول سے چہرے والی
اک لڑکی روز آتی ہے
کاؤنٹر سے لگ جاتی ہے
اس کے تن پر روز نئی ساڑی ہوتی ہے
سینڈل
کنگن
اور دوسری چیزیں بھی
ساڑی ہی کے رنگ سے ملتی ہوتی ہیں

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ
اس سے پوچھوں
بارہ سو روپے میں کیسے
اتنا سب کچھ ہوتا ہوگا
پھر یہ سوچ کے رُک جاتا ہوں
پوچھوں گا تو
ٹھیس لگے گی
خوشیاں نازک ہوتی ہیں
مر جائیں گی

دی سورت ٹیکسٹائل مارکیٹ

سر پہ باندھے ہوئے بڑی سی گھڑی
دور تک چاروں اور پھیلا ہے
جسم کا اس کے آخری حصہ
گھومتا یوں ہے، جیسے دنیا ہو
لوگ دنیا ہی کی طرح اس میں
آتے رہتے ہیں جاتے رہتے ہیں
بندھا رہتا ہے ایک تانتا سا
یوریو، مائیکرو، چامنڈی
ٹیسوفائل، جیکاڈ، پیچ، روٹو
ماربل، انتظار اور پونم
آدمی ہی کی طرح اچھے سے
رکھے ہوتے ہیں نام کپڑوں کے
کیا پتہ نام کون رکھتا ہے؟

ان گنت تھان روز کپڑوں کے
مل سے شاداب ہو کے آتے ہیں
چار دن رہتے ہیں دکانوں پر
اپنے رنگوں پہ ناز کرتے ہیں
اور پھر موت کی طرح کوئی
تن کے آتا ہے ایک بیوپاری
سارے کپڑے خرید لیتا ہے
جیسے بستی کوئی اجڑ جائے
چھوکرے پارسل بناتے ہیں
جیسے تابوت مردہ لوگوں کے
اور پھر جیسے میری آنکھوں کو
دور تک کچھ نظر نہیں آتا
سوچتا ہوں دکان پر بیٹھا
ایک دن میں بھی انہی کپڑوں سا
گھر سے ڈس پچ ہو کے نکلوں گا

○

نہ جانے کیا ہے، کہ چپ ہیں زبان والے بھی
سڑک پہ آگئے اب کے مکان والے بھی

خلا کے اوپری حصے میں وہ عذاب آیا
زمیں پہ رہنے لگے آسمان والے بھی

ہمیں نہ دیکھ! کہ سیلاب لے گیا ہم کو
شناخت کھونے لگے ہیں نشان والے بھی

نہ جانے وہ کھلی کشتی پہ کس طرح ہوگا
یہاں تو ڈوب گئے بادبان والے بھی

کبھی کبھار جو ہم کو ترا خیال آیا
تو یاد آئے بہت خاندان والے بھی

شکیل ایک ہمی فاقہ مست ہیں، ورنہ
امیر ہوگئے سورت میں پان والے بھی

○

بستی میں ایک گوشۂ ویران ہی تو تھا
پھٹ بھی گیا تو کیا ہے گریبان ہی تو تھا

تم بھی ذراسی بات کو گھر لے کے آگئے
فٹ پاتھ پر جو مرگیا انسان ہی تو تھا

اچھا ہوا کہ چاند سمندر میں جاگرا
اے رات! ہم پہ یہ ترا احسان ہی تو تھا

بچوں نے توڑ بھی دیا اس کو تو کیا ہوا
مٹی کا ایک چھوٹا سا گلدان ہی تو تھا

ماتم گزشتہ رات کی چوری کا کیا کریں
کمرے میں ایک میرؔ کا دیوان ہی تو تھا

آنکھوں سے یہ سراب بھی بچ کر نکل گیا
ٹوٹا جو رات کانچ کا پیمان ہی تو تھا

مانا کہ دل کے پاس سے گزرا، مگر شکیلؔ
آخر وہ ایک لمحۂ انجان ہی تو تھا

○

قربان آدمی کے لئے جسم وجاں نہ کر
مٹی کے نام اتنا بڑا آسماں نہ کر

رکھ دے سنبھال کر کہ کبھی کام آئے گا
پتھر جو آگا ہے اسے رائگاں نہ کر

چولھے میں پھونک مار، کہ جل جائیں لکڑیاں
آنکھیں بہت اداس ہیں گھر میں دھواں نہ کر

میں اپنے آئینے سے نکل کر نہ آؤں گا
ہر چلتی پھرتی چیز پہ میرا گماں نہ کر

تو میری بات کر، کہ ترا آئینہ ہوں میں
جو عکس تیرا ہے اسے درمیاں نہ کر

○

ہوا سے ناؤ بچالی تو بادبان گرا
زمیں کو سر پہ اٹھایا تو آسمان گرا

چلو، کہ چھاؤں کے احسان سے تو بچ نکلے
سفر سے لوٹ کے آئے تو سائبان گرا

قبیلے والوں کے سارے قیاس سچ نکلے
جو سب سے اونچا اٹھا تھا وہی نشان گرا

بکھر کے رہ گیا سارا سکون کمرے میں
ذرا سا میز ہلی اور پھولدان گرا

کبھی کبھی اسی ملبے سے بولتا ہے کوئی
ہوا کے آخری حملے میں جو مکان گرا

لکیر، شرط تھی سب سے بڑی سہارے کی
ذراسا بڑھ کے جو دیکھا تو پائیدان گرا

پرندے کھیت سے اس بار بھوک لے کے گئے
اناج گھر میں چلا آیا تو مچان گرا

○

کوئی ملبوس ہو، کستا نہیں ہے
ہمیں اب سانپ بھی ڈستا نہیں ہے

یہاں سب اپنی چھت پر چل رہے ہیں
گھروں کے بیچ میں رستہ نہیں ہے

درختوں پر قصیدے لکھ رہا ہوں
کلہاڑی میں ابھی دستہ نہیں ہے

یہ بچے جانے کس اسکول کے ہیں
کسی کی پیٹھ پر بستہ نہیں ہے

سبھی کو خوف رہتا ہے ہوا کا
زمیں میں کوئی پیوستہ نہیں ہے

چھپایا جائے کیسے آئینے کو
کوئی پتھر سے وابستہ نہیں ہے

عجب دستورِ شہرِ دل ہے بابا!
اجڑ جائے تو پھر بستا نہیں ہے

○

مرے وجود کو چھونے کی ضد کرے کوئی
میں پھیل جاؤں اگر منجمد کرے کوئی

بہت دنوں سے کوئی معرکۂ خوں نہ ہوا
مرے خلاف ہی مجھ کو بضد کرے کوئی

تمام لوگ مرے خط و خال میں گم ہیں
اٹھا کے ہاتھ مجھے منفرد کرے کوئی

کہیں تو ختم ہو آکر یہ میری بے دینی
کبھی تو مجھ کو ترا معتقد کرے کوئی

پڑی جو رات تو سب تارے ایک ساتھ چلے
مری زمین کو بھی متحد کرے کوئی

○

سخت سردی ہے بدن اون میں رکھے رہئے
اس حرارت کو ابھی خون میں رکھے رہئے

سرخ رو ہونے ہی والی ہے لہو سے مٹی
خود کو یونہی صفِ مجنون میں رکھے رہئے

سلسلہ ختم نہ ہو رحم وکرم کا صاحب!
ہم کو بھی حلقۂ ممنون میں رکھے رہئے

دل کی خاموشی کو آواز دے آ کر کوئی
کب تلک شہر کو طاعون میں رکھے رہئے

یہ جو اک شکل عطا کی ہے غزل کو ہم نے
بس اسی بھیس اسی جون میں رکھے رہئے

○

رات، سردی، خوف، جنگل اور میں
ایک لڑکی، ایک کمبل اور میں

بار، ہوٹل، فلم، پکنک، مستیاں
چار دن جنگل میں منگل اور میں

دیر تک کرتے ہیں ادبی گفتگو
ایش ٹرے، وسکی کی بوتل اور میں

روح تک جلتے ہوئے ماتھے کا شور
اک ہتھیلی نرم کومل اور میں

گاؤں، مکتب، چھپنا، تختی، کتاب
کھیل، تھپڑ، ماں کا آنچل اور میں

ٹوٹتے رہتے ہیں مٹی کے لیے
پھول، خوشبو، رنگ، بادل اور میں

بھاگتی سڑکیں، دھواں، گرد و غبار
آٹورکشہ، چوک[1]، بھاگل[2] اور میں

[1]-[2] سورت کے مصروف ترین چوراہے۔

وار ہلکا تھا، مگر گھاؤ بہت آیا ہے
آئینہ دیکھ کے بکھراؤ بہت آیا ہے

اس نے چہرے پہ ملے ہیں مرے جھوٹے آنسو
پل سستا تھا مگر بھاؤ بہت آیا ہے

آسماں بھی اسے سنتا ہے کھُلے کانوں سے
اس کی آواز میں پھیلاؤ بہت آیا ہے

اس کے ہونٹوں پہ بھی موسم نہ رہا پہلا سا
میری آنکھوں میں بھی بدلاؤ بہت آیا ہے

ایسا لگتا ہے کہ آجائے گا گھر تک پانی
اب کے دریاؤں میں ٹھہراؤ بہت آیا ہے

مٹی کے رنگ روپ میں ڈھل جانا چاہئے
موسم کے ساتھ ہم کو بدل جانا چاہئے

ہم لوگ جانے کیسے مسافر ہیں، ورنہ یار!
دوچار ٹھوکروں میں سنبھل جانا چاہئے

پتھر وہ ہاتھ میں لئے نزدیک آگیا
اب ہم کو آئینے سے نکل جانا چاہئے

سورج کا ظلم کتنا سہے گی مری زمیں
اب آسمان کو بھی پگھل جانا چاہئے

یہ شرط بھی لگادی گئی اب کے کھیل میں
جلنے کے بعد رسی کا بل جانا چاہئے

O

رات بھی آ کے گئی، دن بھی ٹھکانے سے لگا
کس قدر وقت بچھڑنے میں زمانے سے لگا

مل بھی سکتا ہے اگر ڈھونڈنے نکلا جائے
آج یونہی تری تصویر بنانے سے لگا

جیسے اس شخص میں میرا بھی کوئی حصہ ہو
بے سبب اس کی طرف ہاتھ بڑھانے سے لگا

کتنا مشکل ہے چراغوں کو جلائے رکھنا
بوجھ سے دبتے ہوئے سر کو اٹھانے سے لگا

اپنی مٹی میں بھی پھیلاؤ بہت تھا، لیکن
آسماں اتنا بڑا ہاتھ نہ آنے سے لگا

سر پہ سورج کے سوا دور تلک کچھ بھی نہیں
دھوپ کیا چیز ہے، سائے کو گھٹانے سے لگا

بوجھ دیوار پہ بھیگی ہوئی چھت کا ہے بہت
گھر کا دروازہ بھی اس بار لگانے سے لگا

○

بجز اس کے کوئی رستہ نہیں تھا
وگرنہ میں ترے جیسا نہیں تھا

وہ کوئی سنگ ہو یا تیری باتیں
اٹھا کر ہم نے کچھ رکھا نہیں تھا

بچھڑ کر اس سے خود کو دفن کرتے
تعلق اس قدر گہرا نہیں تھا

زمانہ تھک چکا تھا زہر دے کر
میں اپنی موت بھی مرتا نہیں تھا

یونہی کچھ سوچ کر رونے لگے تھے
کسی نے ہم کو کچھ بولا نہیں تھا

○

سب بھکاری تھے، شاہ میں بھی نہ تھا
آدمی بے گناہ میں بھی نہ تھا

لوگ میرے خلاف تو تھے ہی
اپنے حق میں گواہ میں بھی نہ تھا

تیر سب چل چکے تھے ترکش کے
اور سمتِ نگاہ میں بھی نہ تھا

دھوپ اب روح تک اتر آئی
ورنہ اتنا سیاہ میں بھی نہ تھا

وہ بھی ناخوش ہے میرے ملنے سے
اس سے پہلے تباہ میں بھی نہ تھا

بدن کی راکھ میں چنگاریاں چھپا رکھوں
غزل کے واسطے دیوانگی بچا رکھوں

وہ لوگ، جن سے ہے منسوب میری ہمسفری
چلوں انہی میں مگر راستہ جدا رکھوں .

مری تلاش بھی اک مسئلہ ہے سب کے لئے
یہ کارِ چشم نئی نسل پہ اٹھا رکھوں

اگر یہ طے ہے کہ سیلاب آنے والا ہے
تو پار اترنے کو اک ناؤ ہی بنا رکھوں

مرا ہی نام لکھا ہے سبھی درختوں پر
کہاں چھپا کے زمینوں میں حادثہ رکھوں

میں ڈوب جاؤں، ہوا اپنا رخ بدلنے لگے
نہ جانے کب یہ زمیں پاؤں سے نکلنے لگے

اجالا کر کے دل و جاں میں بیٹھا رہتا ہوں
دیا بجھاؤں تو ممکن ہے کوئی جلنے لگے

کبھی کبھی تری آواز سن کے یوں بھی ہو
خیال جسم نے آنکھ میں پھسلنے لگے

وہ میرے اشک ہوں یا تیری یاد کے جگنو
کوئی چراغ جلے کوٹھری اُجلنے لگے

گذشتہ شب مرا لفظوں سے رابطہ یوں تھا
کہ جیسے خاک سے چشمہ کوئی اُبلنے لگے

○

خالی چھت پر اب بھی ایک پرندہ ہے
سناٹے میں شور برابر زندہ ہے

آندھی کے جھگڑے میں میرا کیا بگڑا
مرنے والا گھر کا اک کارندہ ہے

خوف گھروں میں گھس آیا ہے جنگل کا
چاند کو کھو کر رات بہت شرمندہ ہے

میری آنکھیں جس کے خواب سجاتی ہیں
جانے کس نگری کا وہ باشندہ ہے

جانے مجھ سے کون بچھڑنے والا ہے
جانے کس کا غم ہے جو آئندہ ہے

میں نے جس کی موت پہ ناول ختم کیا
مجھ میں وہ کردار ابھی تک زندہ ہے

ڈر لگتا ہے منظر کی شادابی سے
پس منظر بھی آنکھوں میں تابندہ ہے

○

کوئی سفر نہ تعین تھا، بے ارادہ تھے
زمیں کے جسم پہ ہم کتنے سادہ تھے

کوئی چراغ کوئی راستہ نہ تھا، پھر بھی
ہم آنکھ موندے ہوئے چلنے پہ آمادہ تھے

وہی چراغ بجھا جس کی لَو اٹھان پہ تھی
وہی درخت گرا جس پہ پھل زیادہ تھے

وہ دن کہاں گئے جو ہم پہ خرچ ہوتے تھے
وہ لوگ کیا ہوئے ہم جن کا استفادہ تھے

حسب نسب کو کسی رہگذر پہ چھوڑ آئیں
یہ بھول جائیں کبھی ہم بھی خان زادہ تھے

○

آ بھی جاتے تو پلٹ کر نہیں جانے دیتا
کل وہ سیلاب ہمیں گھر نہیں جانے دیتا

کتنے مجبور تھے ہم اندھے سفر پر اب کے
آنکھ لے جاتے تو منظر نہیں جانے دیتا

سوچتا ہوں کہ کہیں دور نکل جاؤں، مگر
اس کی آنکھوں کا سمندر نہیں جانے دیتا

بند کر دیتا ہے کمرے میں مجھے رات کا خوف
در و دیوار سے باہر نہیں جانے دیتا

اتنا چالاک ہے سردار قبیلے کا مرے
ہار جاتا ہے مگر سر نہیں جانے دیتا

○

فلک پہ رہتا تھا لیکن زمیں پہ ملتا تھا
کبھی کبھار وہ ہم کو یہیں پہ ملتا تھا

غزل کے جتنے ہدف تھے وہ سب ہمارے تھے
جنوں کا سارا لبادہ ہمیں پہ ملتا تھا

کسی کے قتل کا الزام بن گیا اب کے
جو داغ پہلے پہل آستیں پہ ملتا تھا

محبتوں میں ہوس راہ پا گئی، ورنہ
مکاں کا کرب بھی روئے مکیں پہ ملتا تھا

تمہارے بعد سحر کی شبیہ ایسی تھی
گمانِ تیرہ شبی بھی یقیں پہ ملتا تھا

افق کا خون محبت کا قتل ہے جاناں
کہ آسمان زمین سے وہیں پہ ملتا تھا

شکیل گاؤں کو چھوڑے تو اک زمانہ ہوا
یہ یاد ہے کہ کوئی تھا کہیں پہ ملتا تھا

○

اجالے چار سو پھیلے دیے تلے ہی نہ تھے
ہوا بجھانے جب آئی تو ہم جلے ہی نہ تھے

جب آسماں پہ نمائش ہوئی تھی رنگوں کی
ہمارے بیج زمیں میں سڑے گلے ہی نہ تھے

یہ آرزو تھی کہ تلسی کے لب بھگوئیں گے
سفر سے لوٹ کے آئے تو آبلے ہی نہ تھے

وہ چاہتا تھا رکھے ہم کو چاند جیسوں میں
بدن ہمارے مگر ایسے سانولے ہی نہ تھے

مکاں وہ بھی غنیمت تھا ایک شب کے لئے
چھتیں تو نکلی تھیں دیوار و در بھلے ہی نہ تھے

اندر کا آدمی

کتنی بار کہا ہے!
گھومنا پھرنا چھوڑو
مسلم گھر میں جنم ہوا ہے
مسجد جاؤ
اللہ سے کچھ بات کرو
قرآن پڑھو
جینے کے کچھ طور طریقے سیکھو
خود کو بدلو
جم کر کوئی کام کرو
گاؤں سے جاکر بیوی اور بچوں کو لاؤ
ساتھ میں رکھو

لیکن تم کو ان باتوں سے کیا مطلب ؟

دنیا کیا اور آخرت کیا؟

تم کو تو غالبؔ بننا ہے

میرؔ ہونا ہے

بنو

مرو

پیٹ میں لے کر بھوک پھرو

ان کی ان کی بات سنو

دن میں سوؤ

رات میں جاگو

دارو اور سگریٹ پیو

گٹکا کھاؤ

روگ لگاؤ

بیوی اور بچوں کو سولی پر لٹکا دو

مجھ کو کیا؟

تم سے میرا رشتہ ہی کیا؟

میں تم میں رہنے والا معمولی آدمی

تم باہر کی دنیا کے باشندے ہو

اپنا شعلہ، اپنی راکھ

میں، کہ فنکار ہوں اجالوں کا

اور اندھیروں میں قید رہتا ہوں

میں ، کہ تخلیق کار ہوں لیکن

بھوک اور پیاس میری قسمت ہے

ایک انگلی کئی سوال لئے

مجھ میں نیزے کی طرح چبھتی ہے

اور میں زخم زخم کاندھوں پر

زندگی کو اٹھائے پھرتا ہوں

وقت رستے میں روک کر مجھ کو

روز و شب کا حساب مانگتا ہے

زندہ رہتے ہیں پھر بھی احساسات
آگہی کے دیے نہیں بجھتے
ہر نئی رات موت کا پیغام
ہر نیا دن ہے زندگی نامہ
روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں
روز جلتا ہوں روز بجھتا ہوں
کوئی دن یوں مروں کہ جی نہ سکوں
کوئی دن یوں بجھوں کہ جل نہ سکوں

امکان سے آگے

میری آنکھیں
رات گئے تک
نئے نئے خوابوں کے پیچھے
چاند کی گلیوں میں پھرتی ہیں
صبح سے پہلے
دیواروں کے سوراخوں سے
گرتی پڑتی
میرے کمرے میں آتی ہیں
مجھ میں روشن ہو جاتی ہیں

تخلیق کار

خدا سے جتنی دفعہ ملا میں
دماغ و دل تھے نہ ساتھ میرے
پتہ نہیں کیا کہا تھا اس نے
پتہ نہیں کیا سنا تھا میں نے
شعور میرا
کس خلا کی
بگڑتی بنتی صلیب پر تھا
میں اس حقیقت کا معترف ہوں

مگر بڑوں سے سنا ہے میں نے
زمیں پہ جب تک عبادتوں کا چلن رہے گا
قلم خدا کا رواں رہے گا
پتہ چلا کہ
عبادتیں ہی
خدا کی تخلیق کا سبب ہیں

زمانے والو!
اگر تمہاری یہ آرزو ہے
کہ لفظ و معنی سے میرا رشتہ کبھی نہ ٹوٹے
تو میری تخلیق کو سراہو
وگرنہ میں بھی
خدا کی طرح
تمہاری شکلیں بگاڑ دوں گا

تفریح کا ایک دن

آج جی چاہتا ہے
گھوموں
پھروں
شہر کی ساری ایسی جگہوں پر
جہاں جسموں کے پھول کھلتے ہیں
اور آنکھوں کے جام چلتے ہیں
لیکن اس وقت کون ہوگا وہاں
شام ہونے کا انتظار کروں
یا کوئی فلم میٹنی شو میں
دیکھ لوں
موڈ پھر بنے نہ بنے
بچ رہوں گا اس انتظار سے بھی
لیکن اک مسئلہ تو یہ بھی ہے
تین گھنٹے میں فلم چھوٹے گی

اور پھر تیز دھوپ، سناٹا
سڑکیں
بازار
اور چوراہے
سب کے سب کولھوں، ٹانگوں سے خالی
ایسے میں
میں کہاں مروں گا یار!
پارک میں بھی کوئی نہیں ہوگا
ورنہ دو گھنٹے یوں نکل جاتے
یار!
وہ چکلے والی نیپالن
فلم کے بعد اس سے مل لوں گا
لیکن وہ بھی تو کاروباری ہے
وہ کہاں اتنا وقت دینے کی
اور وہاں جاتے کوئی دیکھ لے تو
اب تو پیچھے کا گیٹ بھی نہ رہا
پھر کہاں لے کے جاؤں دو گھنٹے ؟
چلو چھوڑو یہ فلم کا چکر
دوپہر گھر پہ ہی بتاؤں گا
تھوڑا کھاوا کے سو رہوں گا یہیں
شام کو فریش ہو کے نکلوں گا

ایکسیڈنٹ

الکترے کی ایک سڑک تھی
اور سڑک کی دونوں جانب
دور تلک جنگل پھیلے تھے
شام کا سورج
اپنی کرنیں
پیڑوں پیڑوں ڈھونڈ رہا تھا
سیندوری مٹی کی گود میں
ننھے پودے
مٹھی بھینچے اونگھ رہے تھے
ایک عجب منظر تھا
جس میں
میری آنکھیں کھوئی تھیں

آنکھ کھلی تو
میں نے دیکھا
میری ٹو وہیلر پہ بھالو بیٹھا تھا
اور کسی بندر کا تھپڑ
میرے گال پہ چسپاں تھا
کچھ بندر بیٹھے روتے تھے
اک بندر کی لاش پڑی تھی

چار آنکھیں

بڑے بڑے پستانوں والی
اک لڑکی
اجلے اجلے ہاتھوں سے دروازہ پکڑے
دیر دیر تک باہر تکتی رہتی ہے
اسی کی آنکھیں
میری آنکھیں
ملتی ہیں
چار ہوتی ہیں
ایک دوسرے کے جسموں میں چبھ جاتی ہیں
رستے میں ہونے والی
انجانی آہٹ
آہٹ پہنے ذہن میں رینگتا اک سایہ
دونوں مل کر
منظر کو کھا جاتے ہیں
لیکن
اک لذت سی
ہاتھ میں رہ جاتی ہے

تخلیق ہوتا ہوا تجربہ

نہ میرے زہر میں تلخی رہی
وہ پہلی سی
بدن میں اس کے بھی
پہلا سا ذائقہ نہ رہا
ہمارے بیچ جو رشتے تھے
سب تمام ہوئے
بس ایک رسم بچی ہے
شکستہ پل کی طرح
کبھی کبھار جو اب بھی ہمیں ملاتی ہے
مگر یہ رسم بھی اک روز ٹوٹ جائے گی
اب اس کا جسم
نئے سانپ کی تلاش میں ہے
مری ہوس بھی نئی آستین ڈھونڈتی ہے

تصویریں چلنے لگتی ہیں

دن بھر
کوٹھے
عریاں ٹانگیں
اور بدن کی دوسری چیزیں
سڑکوں پر چلتی پھرتی ہیں
پارکوں میں
اور
بازاروں میں
گھومتی ہیں
چوراہوں پر ٹو وہیلر اور کار رستہ تکتی ہیں
رات کو بستر پر جاؤ تو
اک البم سا کھلتا ہے
تصویریں کمرے میں چلنے لگتی ہیں
ذہن، بدن کے خاص حصوں کو متحرک کر دیتا ہے
آنکھیں شب بیداری سے جب تھک جاتی ہیں
اسکرٹ اوڑھ کے سو جاتی ہیں

بازو والا کمرہ

پنکھے کی بے جان ہوا سے گھبرا کر
خون چوستے کھٹمل کو
چکمہ دے کر
آدھی رات کو گیلری میں آ جاتا ہوں
جیسے تیسے بستر کر کے
سونے کی کوشش کرتا ہوں
لیکن نیند نہیں آتی
بازو والے کمرے میں چوڑی بجتی ہے
آنکھ کسی منظر کا پیچھا کرتی ہے

بستر کی نظم

پہلے تن پر میل لپیٹے
دھول بھرے بکھرے بالوں میں
ننگی اور زخمی ٹانگوں سے
شہر میں اک پاگل پھرتا ہے
آتے جاتے ہر منظر کو
خالی آنکھوں سے تکتا ہے
رات کو اس کے گندے کپڑے
میرا جسم پہن لیتا ہے
اور مجھے نیند آجاتی ہے

پاکستان کے نام!

مرے بزرگوں
تمہارے پرکھوں میں
ایک رشتہ تھا زندگی کا
کہیں کہیں سے یہی تعلق
لہو کے بن کر چمک اٹھے تھے
ہمارے آنگن مہک اٹھے تھے
اگر تمہیں بھی خبر ہے اس کی
تو آؤ مل کر
پرانی تہذیب ڈھونڈتے ہیں
کسی بھی شمشان گھاٹ جاکر
کہیں بھی قبروں کے پاس رک کر
وہاں سے نکلیں تو
اپنے پتھر بدن کو توڑیں
پرانی مٹی کو جسم کر لیں
پرانی قدروں کو روح کر لیں

تم اپنی حد سے مجھے پکارو
میں اپنی حد سے تمہیں پکاروں
یہ ایک کانٹا
جو درمیاں ہے
ہمارے چھونے سے پھول بن جائے
چلو کبھی تو یہ کر کے دیکھیں
ہم اپنے اندر اتر کے دیکھیں

کشمیر

ایک کبوتر
خون میں لت پت
دو چیلوں کے پنجوں میں
اپنے شہپر ڈھونڈ رہا ہے

کالے موسم کی سفید نظم

ہم پچھلے سیلاب کو کب کے بھول چکے
وہ پچھلا سیلاب
کہ جس نے
گھر میں گھس کر ساری چیزیں
یہاں تلک کہ چھپر اور دروازے بھی
لوٹ لیے
اور
دریاؤں میں پھینک دیے
مانا کہ پھر
بیچ کے آتے جاتے موسم
دھوپ ہوا بھی لے آئے
اور بدن کی گیلی مٹی سوکھ گئی
ہاتھوں اور پیروں میں پھر سے جان آئی
آنکھوں میں خوابوں کی شمعیں جل اٹھیں

لیکن برسوں بعد
درو دیوار نے
پھر سے
رنگ و روغن چھوڑ دیے
روشندان سے آنے والی گرم ہوا
چھپر کے سوراخ میں روشن چاند ستارے
دیکھ رہے ہیں
اور
ہمارے بھولے پن پر ہنستے ہیں
ہم پچھلے سیلاب کو کب کے بھول چکے
پانی بنیادوں میں اب بھی بیٹھا ہے

نیا بھارت

پھر نئی صبح آئی ٹیبل پر
چائے اخبار لے کے ہاتھوں میں
"رام مندر وہیں بنائیں گے"
"کاشی، متھرا بھی ہندوؤں کے ہیں"
"گائے ماتا کا قتل بند کرو"
یہ نئی سرخیاں نہیں ، لیکن
ان کی تجدید ہوتی رہتی ہے
لیڈروں کے بیان چھپتے ہیں
اور ماحول گرم رہتا ہے
سارے اخبار، ریڈیو، ٹی وی
سب کے سب دھرم یدھ میں شامل
گونگی بہری صحافتیں سب کی
اور بے حس ادارتیں سب کی
ساری سینائیں اور سارے دل
ملک کو توڑنے کے درپہ ہیں
سارے منشور سارے ایجنڈے
پاک روٹی قلم کتاب سے ہیں

بھوک اب کوئی مسئلہ ہی نہیں
بے لباسی کوئی سوال نہیں
مسئلے ذات اور مذہب ہیں
اور ضرورت ہیں مندر و مسجد
ہر طرف لاش، خون، چیخ ، دھواں
کوئی انسان اب نہیں باقی
جو بچے ہیں وہ ہندو مسلم ہیں
قومی یکجہتی مرچکی ہے یہاں
کہیں جمہوریت کا نام نہیں
مندروں، مسجدوں کے گنبد سے
اجلے اجلے کبوتروں کے جھنڈ
ہجرتِ دشت پر ہوئے مجبور
امن، پوجا، عبادتیں، کلچر
منتقل ہورہے ہیں جنگل میں
دیوتاؤں کے دیپ ٹھنڈے ہیں
کان بے ربط ہیں اذانوں سے
دودھ میں زہر گھل چکا ہے یہاں
اور شکر سے مٹھاس غائب ہے
چائے نیلی ہے اور کڑوی ہے
ہم یہی چائے روز پیتے ہیں
اور اسی ذائقے کے عادی ہیں

بُخار

میں ڈاکٹر بھی ہوں اپنا
مریض بھی میں ہی
بخار تیز ہے
اور وہ بھی
رات کا ہے سمے
نہ بازو والے مکانوں میں ٹی وی بجتا ہے
نہ روڈ پر کوئی آواز ہی ابھرتی ہے
نہ آس پاس پولس چوکی کے
پولس والے
ہیں خالی خالی سے فٹ پاتھ
لاریاں بھی نہیں

کسے تلاش کروں
اور صدائیں دوں کس کو
یہاں پہ کوئی نہیں ایک میلے جگ کے سوا
پرانی لنگی کے ٹکڑے ہیں باسی پانی میں
میں اپنے ہاتھوں سے اپنے دہکتے ماتھے کی
پلنگ پہ لیٹا ہوا پٹیاں بدلتا ہوں

پینے کے بعد

شام ڈھلی تو
بیئر بار میں دن نکلا
وسکی کے دو پیگ میں سارے غم ڈوبے
ادب، سیاست، مذہب سے تاریخ تلک
ہر موضوع پہ تھوڑی تھوڑی بات چلی
ہندو، مسلم
مندر، مسجد
کو لے کر
کئی سیاسی لیڈر پہ تلوار چلی
ہندو پاک کے بٹوارے پر
قائدِ اعظم اور باپو سے نفرت کا اظہار ہوا

سارے اچھے ادبا شعرا ہدف بنے اپنی گالی کے
علامہ اقبال کو جوڑا اڈوانی سے
میر و غالب خاک ہوئے
فاروقی، نارنگ، وارث کی تنقیدوں میں کیا رکھا ہے؟
علوی اور ندا سے ہم اچھا لکھتے ہیں

ہوش آیا تو
سبھی کتابیں
کمرے کے اندر بکھری تھیں
ہم نے ان کو باری باری
چن کر چوما
گلے لگایا
اور سلیقے سے لے جا کر میز پہ رکھا
صبح کا سورج علم کی کرنیں لے آیا
آنکھوں میں پھر پاکی آئی
رات گئی اور بات گئی

کوئی چہرہ

جانتا ہوں کہ بارش بھی اک موسم ہے
موسم!
جو بدلا کرتے ہیں
لیکن اس موسم میں کوئی
آسمان پر بیٹھا بیٹھا
بادل کے ٹکڑوں سے چہرے گھڑتا ہے
چہرے!
جو بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں
کبھی کبھی ان چہروں میں سے
کوئی چہرہ
ہنستا ہے
باتیں کرتا ہے
اچھا لگنے لگتا ہے
بگڑے تو دکھ ہوتا ہے

میں روشنی ہوں

تم مجھے پہچان سکتے ہو
مرے ناظر ہو تم
بارہا تم نے پڑھا ہے اور دیکھا ہے مجھے
میری تصویروں سے تم واقف بھی ہو
مانوس بھی
میرے البم میں جو چہرے ہیں
وہ سب میرے ہی ہیں
ان میں جو بدلاؤ ہے
جو فرق ہے
وہ عمر ہے اور زاویہ ہے
کوئی ترچھا
کوئی سیدھا
پاس کچھ اور دور کچھ
کوئی چہرہ مونچھ والا
اور کسی پر بال ہیں داڑھی کے بھی

ان میں زیادہ تر مگر ایسے ہیں
جن پر مونچھ اور داڑھی نہیں ہیں
میرا پس منظر بھی منظر ہی میں ہے
تم مجھے جتنا سمجھ پائے ہو
وہ کافی نہیں ہے
میں تمہاری سوچ سے آگے
بہت آگے ہوں میں
تم جہاں ٹھہرے ہو
جس دیوار کو پکڑے ہوئے ہو
اس کی سب سمتوں کو ڈھونڈو
غور سے دیکھو
ٹٹولو
اس میں ہی تم کو کہیں اک در ملے گا
جس کے پیچھے روشنی ہے
روشنی ہی میں ہوں
میں ہی روشنی ہوں
مجھ کو کھولو اور اپنی ذات کے اندر سمو لو
روشنی جب تم میں اترے گی
تو تم بھی ایسے ہی چمکو گے
جیسے میں چمکتا ہوں

میں بے ہنر ہوں

مرے خدا !
اک تو ہی ہے برتر
ترے علاوہ کوئی نہیں ہے
تمام عالم کا تنہا خالق
بس اک تو ہی ہے
ہر ایک شے ہے بگڑنے والی
زوال سب میں رکھا ہے تو نے
بس اک تو ہی ہے جو جاوداں ہے
درخت لکھتے ہیں تجھ پہ نظمیں
پرندے گاتے ہیں گیت تیرے
چرندے گھاسوں میں تیری عظمت تلاشتے ہیں
زمینیں اپنے تمام ذروں کو سر پہ رکھے
بلند ہاتھوں سے مانگتی ہیں سلامتی کی دعائیں تجھ سے

انہی دعاؤں کے سلسلوں میں کہیں ہوں میں بھی

میں جانتا ہوں

رحیم ہے تو

کریم ہے تو

میں تیرا قاری

میں تیرا سامع

مری سماعت سے تیرا رشتہ نیا نہیں ہے

ازل سے تجھ کو میں سن رہا ہوں

تو میری سانسوں میں گھُل گیا ہے

ترے مطالعے سے میری آنکھوں میں روشنی ہے

ترا تصوّر مرے خیالوں کی زندگی ہے

یہ وصف تیرا ہے

جس نے مجھ کو بھی

خلق کرنا سکھادیا

یہ حرف میرے

یہ لفظ میرے

تری چمک سے چمک رہے ہیں

میں بے ہنر ہوں